MAHAR M.
MAZHAR KATHIA
Official Chanel
Youtube.com
گلی گلیاں
میرزا ادیب
10979

(افسانے)

میرزا ادیب

مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۸

اشاعت اوّل	۱۹۸۷ء
سرورق	موجد
کتابت	قاضی مختار
طابع	عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی
قیمت	پچاس ۵۰ روپے

ملیحہ اور عظمٰے

کے نام

بہت بہت محبت کے ساتھ

فہرست

میرزا ادیب کے افسانے

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

میرزا ادیب کی کہانیوں کا یہ مجموعہ اُن کے فنی سفر کے اُس لمحہ کا ترجمان ہے جہاں مشاہدہ، فنی تربیت، فنی خلاقی اور اسلوبی دبازت کمل ہو کر ایک کُل کی تکمیل کرتے ہیں، ان کہانیوں کے پیچھے ان کا برسوں کا تجربہ، زندگی کا وسیع مشاہدہ اور اس کی تہ میں اتر کر محسوس کرنے والی تجزیاتی نظر اور ایک طویل تخلیقی عمل کا پھیلاؤ ہے۔ اس لیے یہ کہانیاں اپنے سیاق و سباق میں جتنی گہرائی اور گیرائی رکھتی ہیں؛ فنی بنت کاری اور اسلوبی پختہ کاری کے بھی اتنے ہی دریچے وا کرتی چلی جاتی ہیں۔ میرزا ادیب نے اُردو کہانی کے ارتقا اور پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ سفر کیا ہے اور کہانی کو اس کی مختلف ادواری تعبیر سے گزرتے دیکھا ہے۔ روایت سے علامت اور تجریدیت کے سارے رویے ان کے سامنے پھلے پھولے اور مقبول و مردود ہوتے ہیں۔ خود انہوں نے بھی مختلف رویوں کو محسوس کیا ہے، اُن میں سے کچھ کو اپنایا اور کچھ کو رد کیا، یہ سارا فنی سفر ان کے ریاض کا حصہ ہے اور آج ان کی کہانی میں جو پختگی اور تہہ داری پیدا ہوئی ہے اس کا ایک حصہ بھی ہے۔

میرزا صاحب کی پہلی چونکا دینے والی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" تھی یہ زمانہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا ہے جب دنیا میں وطن پرستی کا ایک نیا رجحان مقبول ہو رہا تھا۔ صحرا نورد کے خطوط میرزا صاحب کے اولیں ادبی تشخص کا ذریعہ بنی تھی، اور اب تک گویا یہ تین چار نسلوں کا ساتھ دے چکی ہے یہ کتاب بلاشبہ اردو کی جدید کلاسیک میں شامل ہے۔ اس کی کہانیوں کو توجہ سے پڑھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والا ظاہری رومانوی فضا کے پس پردہ کسی اور اہم معاملہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر یہ محض طلسم و حکایاتی تسلسل کی کہانیاں ہیں تو میرزا صاحب نے سارے اتفاقات کا محور حب الوطنی کو کیوں بنایا اور وطن پرستی کو مرکزیت دے کر اختتام کیوں کیا؟ اس سلسلے میں یہ نکتہ اہم ہے کہ یہ کہانیاں اس وقت لکھی گئیں جب برصغیر میں وطن پرستی کی آگ ایک شعلہ جوالہ بن چکی تھی کسی باشعور شخص کا اس سے الگ رہنا ممکن نہ تھا۔ صحرانورد کے خطوط میں بھی یہ رجحان نمایاں طور پر موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مروجہ حقیقت نگاری کی بجائے میرزا صاحب نے ماحول کی ترجمانی کے لیے رومانوی انداز و لہجہ اختیار کیا ہے اس کی ایک وجہ تو طبیعت کی انفرادیت ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ حقیقت نگاری جس طرح عامیانہ سطح پر اتر آئی تھی، اس سے بچنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ حقیقت بھی مجروح نہ ہو اور عمومی طریقۂ کار سے بچنے کا ایک پہلو بھی نکل آئے، میں نے تو جب بھی ان خطوط کو پڑھا ہے، ایک نیا لطف آیا ہے اور ظاہر کے پیچھے بہت کچھ دکھائی دیا ہے۔

میرزا ادیب نے کہانی لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب اردو کہانی پوری مہک کے ساتھ اپنی پہچان کروا چکی تھی اور بڑے لکھنے والوں کی ایک کھیپ میدان میں موجود تھی، یہ ترقی پسند خیالات و رجحانات کا زمانہ تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا، میرزا ادیب نے اسی حوالے سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا، لیکن اس ابتدائی زمانے میں بھی ان کی کہانیوں میں ایک انفرادی رنگ موجود تھا اور وطن پرستی کے رجحانات کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات کا آہنگ اور رومان کا ایک زیر و بم ذائقہ ان کی کہانیوں کو عام ترقی پسند کہانیوں سے علیحدہ کرتا تھا۔ اس زمانے میں بھی انہوں نے مسائل کا براہ راست بیان کرنے کی بجائے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں سے اپنے کردار تلاش کیے اور ان کے حوالے سے عصری حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ زمانہ حقیقت نگاری کا تھا، یہ حقیقت نگاری میرزا ادیب کے یہاں بھی موجود ہے لیکن تھوڑے مختلف انداز اور رویہ سے یہ مختلف انداز اور رویہ دروں بینی اور تجزیہ کا حامل ہے جو ان کی ابتدائی کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہی دروں بینی، کشف اور فنی تجسس بعد میں معنوی تہ داری کی شکل میں تبدیل ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ ان کی کہانیوں میں ایک ایسا معاشرتی ماحول پیدا ہوا کہ کہانی نہ صرف اپنے عہد کی سماجی سیاسی کیفیات کی حامل ہوئی بلکہ کردار انفرادیت کی سطح سے بلند ہو کر ایک بلیغ اشاریہ کی سطح پر

آ گئے۔ اس سارے سفر میں مشاہدے کی گہرائی، چیزوں کو ان کے باطن میں اتر کر دیکھنے کی عادت، اور زندگی کا وسیع تجربہ وہ عطیہ ہے جو سادہ سی اور عام سی صورتِ حال میں بھی ایک غیر معمولی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، زندگی ان کے یہاں ایک نئی معنویت سے آشنا ہوتی ہے۔ انہوں نے انسانی المیوں اور خوشیوں کو المیہ اور خوشی کی سطح تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کیفیات میں انسانی نفسیات کی ان دیکھی پرتوں کو تلاش کر کے تخلیقِ آدم کو ہمہ جہت معنوں سے روشناس کرایا ہے۔

میرزا ادیب کی کہانیاں زندگی کے وسیع افق پر پھیلی ہوئی ہیں اور انہوں نے سماج کے سبھی طبقوں کی عکاسی کی ہے۔ ان کی کتاب ساتواں چراغ کے حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ زندگی کو اس کے تمام رنگوں کے ساتھ رواں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس روانی کو ایک اخلاقی نظام کے تابع بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کہانیوں میں معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ اخلاقی رویے پر بھی زور دیا جاتا ہے انہوں نے گھریلو زندگی کی پیچیدگیوں کو فنکارانہ معصومیت کے ساتھ دیکھا اور پیش کیا ہے۔ 'صحرا نورد کے خطوط' سے 'ساتواں چراغ' تک ان کی کہانیوں میں کبھی زیرِ سطح اور کبھی نمایاں طور پر ایک پراسرار فضا موجود رہی ہے۔ یہ فضا اس مابعد الطبیعاتی لہر کا حصہ ہے جس سے وہ اپنی کہانی کو مادراء کے عنصر تازگی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ انہوں نے معاشرتی سلوٹوں کو صرف مادی سطح تک محدود نہیں کیا بلکہ انسان کو اس کے وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ بدن کی طلب کے ساتھ ساتھ روح کی طلب کے معاملہ کو بھی سامنے رکھا ہے، بلکہ کئی کہانیوں میں انھیں ایسے حسین امتزاج سے پیش کیا ہے کہ کہانی کی کئی معنوی جہتیں وجود میں آ گئی ہیں۔۔۔ تازہ مجموعہ کے حوالے سے اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرزا ادیب بنیادی طور پر ایک مرکزی کلیت کو قائم دیکھنا چاہتے ہیں، یہ مرکزی کلیت گھر کے تقدس کی امین بھی ہے اور سماجی ارتقاء کی دلیل بھی۔ ان کا سارا اخلاقی فلسفہ دراصل انسانی سکون اور خوشی کی تلاش ہے، ان کے تقریباً بنیادی انسانی المیہ میں سے زندگی کرنے کی جدوجہد کا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میرزا صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ترقی پسندی کے جوش میں انھیں طائب نہیں بناتے بلکہ اپنے اپنے سماجی حالات میں ان کی اس طرح پہچان کراتے ہیں کہ وہ زندگی

کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک آدرش کی تکمیل بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ گھر ان کے نزدیک انسانی زندگی کی بنیادی اکائی ہے جو سکون اور عاقبت کی علامت بھی ہے، وہ اس اکائی کو جدید یلغار سے بچانا چاہتے ہیں، لیکن قدامت پسندی کے حوالے سے نہیں بلکہ بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے کر، یہ ایک ارتقائی تسلسل بھی ہے اور روحِ عصر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی ترغیب بھی۔

میرزا ادیب نے تجریدیت سے گریز کرتے ہوئے علامت کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے، یہ علامت ان کے اسلوب اور خیال دونوں سطحوں پر موجود ہے، فنی طریقۂ کار میں انہوں نے ہمیشہ یہ خیال رکھا ہے کہ جملے کی ساخت میں ثقالت پیدا نہ ہو، لفظوں کی نشست اس طرح ہو کہ جملہ خود بخود اگلے جملے سے مربوط ہو جائے، لیکن معنوی گہرائی اپنی جگہ رہے، چنانچہ ان کی کہانیوں کا اسلوب بظاہر سادہ اور عام فہم دکھائی دیتا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ کہانی کے باطنی آہنگ اور مطالب کی تہ داری کا پورا ساتھ دیتا ہے۔ یوں ان کی سادہ سی کہانیاں بھی جہانِ دگر کا ذائقہ رکھتی ہیں۔ اس عمل کو ان کے طویل فنی ریاضت کا ثمر کہا جا سکتا ہے، لیکن فنی کمال اُس وقت تک بامعنی نہیں بنتا جب تک اس کے ساتھ سیاسی سماجی شعور کی بیداری شامل نہ ہو، لکھنے والے کا مشاہدہ، مطالعہ اور سب سے بڑھ کر زندگی کے ساتھ رابطہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ میرزا ادیب کی کہانیوں میں جو معنوی پھیلاؤ ہے اور جس طرح زندگی اپنے مختلف روپ میں منعکس ہوتی ہے وہ اس کا واضح اظہار ہے کہ انہوں نے نہ صرف زندگی کو اس کے اندر اتر کر محسوس کیا اور دیکھا ہے بلکہ ایک باشعور فنکار کی طرح وہ سارے سیاسی سماجی عمل میں شریک رہے ہیں اور اس سارے معاشرتی ڈھانچے کو تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ میرزا ادیب نے اپنا سفر ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا اور اپنے زمانے کی حقیقت پسندی کا ساتھ دیا تھا لیکن ان کی کہانیاں بے محابہ حقیقت نگاری تک محدود نہیں رہیں۔ یہ ان کا کمال ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اس بات کو محسوس کیا کہ فن محض خارجی عکاسی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ خارج سے ماورا ایک نئی دنیا کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ خارج سے آگے نکل کر ایک نئے خواب کی تعبیر ڈھونڈی ہے اور اس تلاش کے نتیجہ میں ان کے یہاں ایک عجب طرح کا نکتہ راز پیدا ہوا ہے۔ یہ مابعد الطبیعیاتی رویہ صوفیت

کی دین نہیں ہے نہ ہی ان کے یہاں جہاں یا مادے سے انکار کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے، بلکہ وہ مادے کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں ایک روحانی کیف تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی ابتدائی کہانیاں ــــ صحرا نورد کے خطوط ہوں یا اس مجموعے کی تازہ کہانیاں ــــ ان سب میں میں ایک نکتۂ راز کا تسلسل ہے، جو کبھی روحانی تہ داری کی شکل اختیار کرتا ہے، کبھی حقیقت نگاری میں ایک باطنی کیف کی خوشبو بنتا ہے اور کبھی جہان سے اوپر اُٹھ کر جہانِ دگر کی خواہش کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ یہ اسرار کہانی کے اندر سے پھوٹتے ہیں، لفظوں سے پیدا نہیں ہوتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے ظاہری طور پر پیدا نہیں کرتے بلکہ یہ بات ان کے تخلیقی سلسلے کا ایک حصہ بن چکا ہے کہ کہانی کی بنت کاری میں وہ اس مہارت سے کام لیتے ہیں کہ کئی تہیں خود بخود وجود میں آتی چلی جاتی ہیں اور یہ اسرار ایک تہ سے دوسری تہ تک پہنچنے کا زینہ بن جاتے ہیں۔

میرزا ادیب کی کہانیاں واقعاتی اور کرداروں کی سطح پر سارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں، یہ زندگی کے ساتھ ان کے وسیع رابطے کی علامت ہے، وہ نہ تو کسی ایک موضوع کے پابند رہے ہیں اور نہ کسی ایک طبقے تک محدود، ان کے کردار مختلف عمروں، مختلف طبقوں اور مختلف سوچوں کے لوگ ہیں، اپنے اپنے مسائل، اپنے اپنے طریقۂ کار اور اپنی اپنی سوچوں کے ساتھ گویا وہ ان کی کہانیوں میں اُگتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور ایک تناور درخت بن کر ساری کہانی پر چھا جاتے ہیں، انہوں نے ہر کردار کو اس کے دائرہ میں رکھ کر دیکھا ہے، انھیں ایک ہی ٹائپ بنانے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی انھیں اپنے خیالات کا ترجمان بنایا۔ بلکہ کردار کو اس کے اپنے پن کے ساتھ پھیلنے کا موقعہ دیا ہے ماحول کی کہانیوں میں بھی وہ حقیقت کی اکہری سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے حقیقت کے دوسرے رُخ کو بھی پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر کہانیاں حقیقت پسندی کے باوجود علامتی ہیں۔

کہانی میں علامت تجریدیا فلسفہ کی کتنی ہی بڑی سطح پیدا ہو جائے، اس کا ذائقہ اور مہک تبھی برقرار رہے گی جب اس کے پیچھے بنیادی طور پر ایک اچھا قصہ گو موجود ہو گا۔ جو اپنے تمام تر کمالات اور

مطالعہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ تجسس، اسرار اور دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ میرزا ادیب کی کہانیاں کا موضوع کچھ ہی ہو، ماحول اور کردار کیسے ہی ہوں ان کے اندر کہانی کہنے کا ایک انداز موجود ہے اور جو یہ بات کہی جاتی ہے کہ اچھا قصہ گو اپنی داستان میں اشیا کو نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے تو یہ بات میرزا صاحب کی کہانیوں پر پوری اُترتی ہے۔ سبھی نہ سہی لیکن ان کی اکثر کہانیوں میں اشیا نیا جنم لیتی ہیں اور زندگی ان میں گنگناتی ہی نہیں اپنا عمل کرتے دکھائی دیتی ہے۔ یہ عمل کرداروں کی سوچوں خوابوں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات سے واضح ہوتا ہے، ان کے کردار عام کردار ہیں لیکن ان میں خواب دیکھنے کی خوبی موجود ہے جو خواب معاشرے کو بدلنے کا خواب بھی ہے اور آئیڈیلزم بھی لیکن میرزا ادیب اس تصوریت پسندی میں حقیقت سے دور نہیں ہوتے، ان کی کہانیاں حقیقت سے تلخ اور تُند رُخ کو بھی پیش کرتی ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ اس ساری صورتِ حال میں سے جینے اور جینے دو کا ایک راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔

انسان اور اس کے اعمال ان کی کہانیوں کی بُنیاد ہیں، ان کے انسان معصوم بھی ہیں، بدکار بھی لیکن کہانی نویس کی حیثیت سے ان کا رویہ سب کے ساتھ ایک جیسا شفیقانہ ہے۔ وہ ـــــــ ان کی ظاہری سطح سے گزر کر ان کی نفسیاتی گتھیوں کو تلاش کرتے ہیں، ظالم اور مظلوم کی جنگ میں ان کی ہمدردیاں بہرحال مظلوم کے ساتھ ہیں۔

میرزا ادیب نے زندگی کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کا طریقہ کار فلسفی کا نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شخص کا ہے جو واردات کو اپنے اوپر بتا کر اس کی معنویت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، چنانچہ انھوں نے کہانیاں بُنی نہیں ہیں، انھیں تلاش کیا ہے، یا شاید کہانیاں انھیں خود تلاش کر لیتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کسی بھی کہانی میں تکنیک کی سختی کا احساس نہیں ہوتا، فنی طور پر ان کی کہانیاں فنِ افسانہ نگاری کے تمام لوازم پوری کرتی ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ کہانی پڑھتے ہوئے کہیں بھی کہانی کا فنی سانچہ یا اسلوب کا بھاری پن بوجھ نہیں بنتا۔ وجہ یہی ہے کہ جب وہ کہانی لکھتے ہیں تو ایک ایسے توازن کے ساتھ کہ اس کے تمام اجزا اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے بھی غیر محسوس ہوتے ہیں۔ یہ بڑے افسانہ نگار کا فن

ہے، ورنہ عام لکھنے والا یا تو تکنیک کے ہاتھوں عاجز ہو جاتا ہے یا تکنیک کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

میرزا ادیب کا فن اب اُس مقام پر ہے جہاں اس میں کلاسیکی نقوش واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں یعنی فن پارے میں اپنے عصر کے بعد بھی زندہ رہنے کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا، عام ادیب اپنے عصری دائرے سے باہر نہیں نکلتا، یا پھر ہنگامی زیست کے موضوعات تک محدود رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ عام قسم کی جذباتی کیفیت بھی فن پارے میں عمومیت پیدا کر دیتی ہے انحرافی خیال، تکنیک اور اظہار کا ایک مرکب عمل ہے جس میں توازن اور سب سے بڑھ کر فن کار کا نقطۂ نظر دائمی مہک پیدا کرتا ہے، انفرادی طور پر کوئی ایک چیز کسی فن پارے کو بڑا نہیں بنا سکتی، بہت عمدہ خیال کمزور اظہار کی وجہ سے عام سطح پر اتر آتا ہے اسی طرح کمزور خیال بہت اچھے اظہار کے باوجود کمزور ہی رہتا ہے، بڑا ادب بڑی بات کو بڑے انداز سے بیان کرنے کا عمل ہے۔ بڑے خیال سے یہ مراد نہیں کہ خیال ہمیشہ نیا اور انوکھا ہو، مطلب یہ ہے کہ فنکار میں یہ خوبی ہو کہ وہ سادہ سی بات میں بھی غیر معمولی پہلو تلاش کر لے۔ میرزا ادیب کے یہاں یہ خوبی بہت سی کہانیوں میں نظر آئے گی کہ وہ سادہ سی صورتِ حال میں سے ایک غیر معمولی کیفیت کو دریافت کر لیتے ہیں، اور جہاں تک ان کے اظہار کا معاملہ ہے تو یہ بات اب بغیر کسی تردد کے کہی جا سکتی ہے کہ کہانی کے اظہار اور تکنیک پر انھیں اتنی گرفت ہے کہ وہ جس موضوع، کردار، ماحول یا واقعہ کو چاہیں کہانی کی شکل عطا کر سکتے ہیں۔ یہ ان کے برسوں کے ریاض کا ثمر ہے۔ انھیں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں شریک کیا جا سکتا ہے۔

میرزا ادیب کی ایک اور اضافی خوبی کہانی میں تخیل، تصور اور حقیقت کی آمیزش کا فن ہے، انھوں نے کہانی کے مختلف دَور دیکھے ہیں، یعنی حقیقت نگاری، رومانیت، علامت اور تجرید لیکن ان کی کہانیوں میں ابتدا ہی سے افسانہ اور حقیقت کا ایک خوب صورت امتزاج موجود رہا ہے۔ صحرا نورد کے خطوط میں بھی تخیل، تصور کی فراوانی کے باوجود حقیقت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس

رومانی فضا میں بھی ٹھوس حقائق، بلکہ مسائل موجود رہتے ہیں، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ انہوں نے تلخ حقیقتوں کو ایک تخیلی فضا میں پیش کر کے عصری حقیقت اور رومان کو یکجا کر دیا ہے۔ صحرا نورد کے خطوط کی کہانیوں کی اوپری پرت بلاشبہ طلسماتی اور حکایاتی تسلسل کے زیر اثر نظر آتی ہے، لیکن اگر آپ ان سب کہانیوں کو ایک ترتیب سے پڑھیں تو وہ ایک مرکزی نکتہ کی طرف لے جاتی ہیں اور یہ مرکزی نکتہ وطن پرستی ہے۔ یہ مثنوی روم کا انداز ہے کہ ظاہری جہان کے پیچھے جہانِ دگر اور ظاہری حکایت کے پیچھے حکایتِ دیگر دکھائی جائے۔ میرزا ادیب کی اکثر کہانیوں میں یہی دوہری معنویت موجود ہے، اس میں بیک وقت حقیقت کا پرتو بھی ہے اور علامت کی دبازت بھی۔ ان کہانیوں کو سرسری نظر سے دیکھنا چاہیں تو سیدھی سادی کہانی ہے جو پڑھنے والوں کو ذہنی کیف سے آشنا کرتی ہے، لیکن غور کریں تو کہانی اپنی پرتیں کھولتی چلی جاتی ہے اور اس میں سارا معاشرہ ہمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

میرزا ادیب کی کہانیوں میں مختلف اجزا مل کر ایک کُل حسن کی تکمیل کرتے ہیں، بڑے ادب کی پہچان یہی ہے کہ وہ ایک مجموعی عمل کو اس طرح تخلیق کرتا ہے کہ اس کے اجزا کو علیحدہ نہ کیا جا سکے، ان اجزا میں کہانی بننے کا فن، اسلوب و اظہار اور دیگر تمام فنی پہلو شامل ہیں جو کسی تخلیق کی تعمیر کرتے ہیں جہاں تک موضوع اور کہانی بیان کرنے کا معاملہ ہے، میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرزا صاحب کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے، زندگی کے تقریباً سبھی ظاہری اور باطنی پہلوؤں پر ان کی نظر ہے انہوں نے اپنی کہانیوں میں جو کردار پیش کئے ہیں، ان کے ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ باطنی اور نفسیاتی کشمکش کی تصویر کشی بھی کی ہے، ان کی کئی کہانیوں میں واقعہ اور کردار یوں ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں کہ انھیں علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، ــــ خالصتاً ماحول کی کہانیوں میں بھی واقعہ اور کردار پورے ماحول کا ایک حصہ بن جاتے ہیں، یہ کہانی کی بُنت کاری کا اسلوب ہے، جس میں اتنی دبازت ہے کہ کہانی ظاہری اور باطنی دونوں سطحوں پر اپنے معنی دریافت کر لیتی ہے۔

میرزا ادیب کی افسانہ نگاری کا عرصہ بہت طویل ہے اور اس دوران اردو کہانی اسلوب کی کئی پرتوں سے آشنا ہوئی ہے، میرزا صاحب نے ان سارے رجحانات میں اپنی اسلوبی پہچان

اس طرح برقرار رکھی ہے کہ نہ تو روائت پسندی کو انا کا مسئلہ بنایا اور نہ ہی اندھا دھند نئے اسالیب کی پیروی کی، ان کے یہاں اسلوب کہانی کے اندرونی ڈھانچے سے جنم لیتا ہے، یعنی جس طرح کی کہانی ہے، اسی طرح کا اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اگر کہانی میں رمزیت و اشاریت زیادہ ہے اور ماحول و کردار کسی گہری نفسیاتی ژرف بینی کے متقاضی ہیں تو انہوں نے علامت سے کام لیا ہے اور ایسی کہانیوں میں ان کے اسلوب میں علامتی دبازت اور جدید اسلوبیاتی آہنگ آ گیا ہے، لیکن اگر کہانی سادگی کا مطالبہ کر رہی ہے تو انہوں نے بیانیہ سے بھی کام لیا ہے، لیکن اس طرح کہ یہ بیانیہ ایک عمدہ نثری آہنگ سے بھرپور محسوس ہو۔ یہ بات اس لئے اہم ہے کہ ہمارے اکثر لکھنے والے ایک خاص طرح کے سٹائل یا طریقۂ کار کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اسے اپنی پہچان بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس حد بندی کی وجہ سے کئی موضوع، کردار اور واقعات ان کے دسترس میں نہیں آتے۔ میرزا ادیب نے اس معاملے میں کھلی آنکھ اور وسعتِ نظر سے کام لیا ہے، انہوں نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی طرح نہ تو روائت پسندی پر زور دیا ہے اور نہ "تازہ ہوا" سے خود کو الگ رکھا ہے۔ ان کے یہاں روائت اور جدت کا اس طرح امتزاج ہوا ہے کہ یہ بات سچ محسوس ہوتی ہے کہ جدت دراصل روائت ہی کا ایک تسلسل ہے۔ اسے آپ ایک فنی توازن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ توازن ان کے اسلوب کا بنیادی جزو ہے۔ ان کے مجموعے "ساتواں چراغ" کے حوالے سے ان کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ میرزا صاحب کی کہانیوں کا فنی اشارہ ان کا خوب صورت اسلوب ہے جس میں روایت کی پاسداری ہے اور جدید اسلوب کی "تازہ کاری" اور پیکر تراشی بھی۔ جہاں ضرورت پڑی ہے انہوں نے اسے علامتی ٹچ بھی دیا ہے۔ اپنے ہم عصروں کی طرح انہوں نے آرائشِ زبان کو کہانی کا زیور نہیں سمجھا بلکہ ایک اور طرح یعنی جملہ کی برجستگی، لفظوں کے چناؤ اور ان کے باطنی آہنگ کے بہاؤ سے منفرد اسلوب بنایا ہے جو ان کی کہانیوں میں تخلیقی بہاؤ پیدا کرتا ہے۔ "صحرا نورد کے خطوط" سے اب تک کی کہانیوں کو دیکھا جائے تو ان کے اسلوب میں تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک ارتقائی صورت بھی دکھائی

دیتی ہے۔ ان کی ابتدائی روحانیت پسندی رفتہ رفتہ حقیقت نگاری سے گزر کر علامتی رنگ اختیار کرتی ہے، لیکن زیرِ بحث ان کی اپنی شخصیت کی ایک چھاپ ہمیشہ موجود رہی ہے جو ان کے اسلوبِ اظہار اور فنی ہئیت کاری کو دوسروں سے علیحدہ کرکے ان کی اپنی پہچان بناتی ہے۔ یہ ان کا فنی ارتقاء بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

میں نے دانستہ طور پر ایک ایک کہانی کا تجزیہ کرنے اور اسے کھول کر بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کہانی کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور کہانی پڑھنے سے پہلے ہی اس کے بارے میں ایک تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر قاری اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق کہانی میں ایک نئی معنویت اور ایک نیا رخ پیدا کرتا ہے، دوسروں کی تشریح اور تجزیہ پہلے پڑھ لینے سے یہ معنویت اور رُخ پیدا نہیں ہوتا، اس لئے اس مجموعہ کی کہانیوں پر براہِ راست بات کرنے کی بجائے میں نے میرزا صاحب کے فنِ افسانہ نگاری کے بنیادی اجزاء تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مقام متعین کرنا میرے بس میں نہیں کہ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے انھیں پڑھ کر لکھنا شروع کیا ہے، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں جب بھی بڑے افسانہ نگاروں کی فہرست بناتا ہوں تو میرزا صاحب کا نام اس میں ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔

رشید امجد

راولپنڈی

۳،۱،۱۹۸۷ء

فاصلے

کوچہ رحمت خاں خاصا طویل تھا۔ دُور دُور تک پُرانے مکانوں کی دو رویہ قطاریں پھیلی ہوئی تھیں، آخر میں جہاں آنے جانے والوں کے لیے راستہ بند کرنے کی خاطر ایک دیوار کھڑی کی گئی تھی آمنے سامنے پانچ دکانیں اس کوچے میں رہنے والوں کی ضرورتیں پوری کر رہی تھیں۔ ان دُکانوں سے کچھ دُور دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک تخت بچھا رہتا تھا، کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ تخت کب بچھایا گیا تھا اور اس کو بچھانے والا کون تھا۔ اور یہ جاننے کے لیے کسی کو ضرورت بھی نہیں تھی دکانداروں کو اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دِقت نہیں تھی، اور نہ اس پر کسی کو اعتراض تھا۔ کسی دکاندار کو دن بھر کے لیے کہیں فالتو سامان رکھوانے کی مجبوری ہوتی تھی تو وہ بلاتکلف اپنی یہ چیزیں اس تخت پر ڈھیر کر دیتا تھا اور دکان بند کرتے وقت انھیں اٹھوا لیتا تھا۔

یہ تخت عام طور پر سامان رکھوانے ہی کے کام آتا تھا مگر چند ماہ سے اس مصرف کے ساتھ ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بھی یہاں دن کا بیشتر حصہ گزارنے لگا تھا، یہ شخص جس کا نام حسین احمد تھا۔ خود اس کوچے میں نہیں رہتا تھا۔ دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ صبح سویرے آجاتا تھا اور دوپہر کے آدھ پونے گھنٹے کے وقفے کے سوا شام تک یہیں پڑا رہتا تھا۔

دکاندار اس سے خوش تھے۔ کیونکہ انھیں اس شخص کے روپ میں ایک قسم کا نوکر مل گیا تھا۔ ایک ایسا نوکر جو کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا۔ اور ہر ایک کا کام بخوشی کر دیتا تھا۔ کسی کو کسی ضرورت سے گھر جانا پڑتا تھا تو وہ اسے دکان میں بٹھا کر چلا جاتا تھا اور دکان کی طرف سے

بے فکر ہو جاتا تھا۔

حسین احمد کے لیے اِن پانچ دکانوں میں سے چار دکانوں کے اندر بیٹھ کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے سودا بیچنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ بشیر اور ارشد کی دکانوں میں دالیں، آٹا اور ایسی ہی اشیائے صرف بکتی تھیں اور وہ اِن کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ تیسری دکان تیلوں اور پان سگریٹ کی تھی۔ اِس سے ملحقہ دکان میں ڈبل روٹی، انڈے، اچار، جام اور اس قسم کی چیزیں دستیاب تھیں۔ پان سگریٹ کی دکان کا کرایہ دار ابراہیم تھا اور ڈبل روٹی اور انڈوں کی دکان میں خود بیٹھتا تھا۔ اِن دکانوں میں بھی بیٹھنے اور وقتی طور پر انھیں چلانے میں حسین احمد کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ البتہ پانچویں دکان جو افضال درزی کی تھی یہاں وہ صرف بیٹھ کر دکان کی چیزوں کی نگرانی ہی کر سکتا تھا۔ درزی کا کام کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

حسین احمد کا تخت پر بیٹھ کر دکانداروں کی کچھ دیر کے لیے ذمے داریاں نبھانا، ایک حادثے کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں دکانداری نہیں کی تھی وہ تو میٹرک کرنے کے بعد ایک دفتر میں بطور کلرک کے بھرتی ہوا تھا اور محنتوں کی رفتار سے ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر پہنچا تھا اور جب اس عہدے پر پہنچا تھا تو اس سے صرف ایک سال بعد مقررہ قواعد کے مطابق ریٹائر کر دیا گیا تھا۔

ریٹائر ہونے کے بعد سارا وقت گھر کی چار دیواری کے اندر گزارنا اس کے لیے بڑا بور کام تھا۔ ایک ماہ تک تو اسے بوریت محسوس نہ ہوئی، دوستوں، عزیزوں نے اپنے گھروں میں چائے کھانے کی دعوتیں دیں۔ ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ گھر کا سامان از سرِ نو ترتیب سے رکھا۔ کتابوں کے لیے الماری خریدی۔ اِس میں پرانی اور نئی کتابیں رکھیں۔ اس طرح تیس دن بیت گئے۔ اگلے جینے کے لیے اُس کے پاس اس نوعیت کا کوئی کام نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ بیوی کو فوت ہوئے دس برس گزر چکے تھے۔ بیٹا ماں کے انتقال کے بعد باپ کا سارا سرمایہ اور جمع جتھا سمیٹ کر انگلینڈ میں جا بسا تھا، جہاں اس نے شادی بھی کر لی تھی۔

بیٹی شادی کے بعد امریکہ اپنے شوہر کے ہمراہ جا چکی تھی۔ گھر میں وہ تنہا رہ گیا تھا۔

دفتر میں کام کرتا تھا تو آدھا دن وہیں گزر جاتا تھا۔ کچھ وقت کسی کے ہاں جا کر تاش وغیرہ کھیل کر گزار دیتا تھا۔ شام کے بعد گھر آتا تھا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر پڑھتا تھا پھر سو جاتا تھا۔ دوسرے روز پھر یہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

اُس کے مکان کے دو حصے تھے۔ اُوپر کی منزل میں اس کی رشتے میں ایک بہن زینب نام کی رہتی تھی۔ جس کے بچوں کی تعداد میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ وہ رات کا کھانا اس کے لیے نیچے بھجوا دیتی تھی۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا حسین احمد دفتر کی کینٹین میں کھاتا تھا یا دل چاہا تھا تو ایک قریبی ہوٹل میں چلا جاتا تھا۔

اس کوچے کی دکانوں سے وہ عموماً سودا سلف نہیں خریدتا تھا۔ ہاں کبھی زینب کہتی تھی تو آٹا، دال یا کوئی اور شے خرید لاتا تھا۔ اُس روز بہن کی فرمائش پر وہ چاول خریدنے گیا تھا۔

دکاندار شیر کے ہاں اس وقت چاول تھے نہیں۔ بولا۔

"جناب بوری آنے ہی والی ہے، بڑی جلدی۔ آپ ذرا اُدھر بیٹھ جائیں۔"

دکاندار نے تخت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حسین احمد نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ضرورت کی چیز دوسری دکان سے خریدے۔ اس لیے چپ چاپ تخت پر جا بیٹھا۔

وہاں بیٹھ کر اُسے عجیب لطف آیا۔ دائیں بائیں حدِ نگاہ تک مکان ہی مکان، کچھ دو تین منزلہ اور کچھ یک منزلہ چھوٹے، دروازوں میں سے لوگ نکلتے ہوئے اندر جاتے ہوئے، کوئی کسی دروازے پر دستک دیتا ہوا، کوئی کسی مکان کے سامنے کسی سے مصروفِ گفتگو، کوئی بچے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ مکانوں کی دائیں قطار کے آگے ایک لڑکا ہاتھوں میں فٹ بال اُٹھائے بھاگ رہا تھا۔ اور اس کا تعاقب ایک بچی کر رہی تھی۔ جو یقیناً اُس کی بہن ہو گی۔ دونوں کے چہرے فرطِ مسرت سے دمک رہے تھے۔ ایک جگہ ایک شخص مختلف چیزوں سے لدا پھندا ایک عورت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ عورت نے بھی دائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ عورت مرد کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ مستقبل کے خوشگوار خوابوں میں بسی

بسی تھی۔ ایک نوجوان کبھی اِدھر دیکھتا تھا اور کبھی اُدھر، اور پھر جلدی سے اُوپر اُس چک پر نظریں ڈال دیتا تھا جیسے لمحہ بہ لمحہ جنبش ہو رہی تھی۔

زندگی کے یہ سارے مناظر اُسے پیارے لگے۔ اُس نے یہ سب کچھ بارہا دیکھا ہوگا۔ مگر اپنے منصبی فرائض کے ہجوم میں ان کا کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس روز یہ ساری سرگرمیاں اُسے دلچسپ لگ رہی تھیں اور اس کا جی چاہتا تھا کہ انھیں کچھ دیر کے لئے دیکھتا رہے۔ وہ وقتی طور پر یہ بھول ہی گیا تھا کہ گھر سے چاول لینے کے لئے نکلا ہے اور اس تخت پر ایک دکاندار کے کہنے پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ گاہک دکانوں پر آ جا رہے تھے اور اُس کو ایک لمحے کے لیے دیکھ کر سودا لینے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

وہ تخت پر بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اچانک معصوم سے قہقہے گونجے۔ کوئی شے اُس کے پاؤں کو چھونے لگی۔

اُس نے اپنے قریب ہی اُسی بہن اور اُس کے بھائی کو دیکھا جو چند منٹ پہلے اُس سے کچھ دور بھاگ رہے تھے۔

"یہ میرا ہے۔"

"نہیں یہ میرا ہے۔"

فٹ بال اُس کے پاؤں کے پاس پڑا تھا۔ اور بیک وقت چار ننھے ننھے ہاتھ اُس کی طرف بڑھے ہوئے تھے۔

"او بدتمیزو"! یہ گرجدار آواز بشیر کی تھی جو بچوں کو ڈانٹ رہا تھا۔

بچے خاموش ہو گئے تھے مگر انھوں نے اپنے ہاتھ نہیں کھینچے تھے۔

حسین احمد نے فٹ بال ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

بچے تخت پر بیٹھ گئے۔ اُس نے فٹ بال بچی کی گود میں رکھ دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر

فوراً اُٹھی اور بھاگ گئی - اُس کا بھائی اُس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ منظر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں بچے کوچے کے دوسرے سرے پر پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

"لیجیے جناب!" بشیر ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

اس نے لفافہ تھام لیا اور دکاندار کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سات روپے۔"

اُسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ اور کب چاولوں کے پیسے بشیر کے ہاتھ میں رکھے تھے۔

یہ اُس کا تخت پر بیٹھنے کا پہلا تجربہ تھا۔

چاولوں کا لفافہ زینب کو دیتے ہوئے اس نے کہہ دیا۔

"زینب! دیکھو! آئندہ کوئی چیز منگوانی ہو تو مجھ سے کہہ دیا کرو۔"

"بچے جو ہیں۔"

"نہیں - میں لایا کروں گا" اُس کا فیصلہ تھا۔

پہلے تجربے نے اُسے ایسی خوشی دی تھی کہ وہ سودا لینے کے لیے جب بھی کسی دُکان پر جاتا تھا۔ دکاندار سے کچھ کہنے کے بعد تخت پر جا بیٹھتا تھا۔ اس طرح تخت اس کے اور دکانداروں کے درمیان روابط استوار کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ دن گزرتے گئے اور یہ روابط بڑھتے چلے گئے۔

گھر میں اُس کے لیے سوائے کتابوں کے مطالعے کے کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی اس لیے وہ باقاعدہ وہاں بیٹھنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ دن کا ایک معقول حصہ خوشگوار ماحول میں گزر جاتا ہے اور دکانداروں نے اس اعتبار سے اُسے غنیمت سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنی اپنی دکانوں سے نکل کر کوئی نہ کوئی کام کاج کر لیتے تھے اور گاہکوں کی طرف سے انھیں کوئی فکر نہیں ستاتی تھی۔ حسین احمد نے اپنی کارکردگی سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں گاہکوں سے نمٹ سکتا ہے۔

کسی دکان پر شور، دوسروں سے پہلے سودا لینے کی جدوجہد، ہلکی پھلکی لڑائیاں، طعنے، مذاق، فقرہ بازی — ان سب چیزوں سے وہ خوش ہوتا تھا۔ دکانداروں سے بے تکلفی بڑھی تو آپ سے مخاطبت تم تک پہنچی۔ پہلے وہ اسے حسین احمد کہتے تھے۔ پھر "گنجو" کہنے لگے۔ مدت ہوئی وہ سر کے بالوں کے معاملے میں فارغ البال ہو چکا تھا اور اُس کی یہی خصوصیت اسے "گنجو" کہلوانے کی ذمہ دار تھی۔

کوئی دکاندار جب اُسے مخاطب کر کے کہتا تھا "آیار گنجو۔ جارہا ہوں۔ بیٹھ گدی پر"۔ تو وہ بُرا نہیں مانتا تھا کہ اِس اندازِ تخاطب میں ایک گہرا خلوص تھا اور محبت تھی۔

اس میں اور دکانداروں میں بے تکلفی کا احساس اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ابراہیم تو اُسے آواز بھی نہیں دیتا تھا۔ چٹکی بجا کر اُسے مخاطب کرتا تھا اور دایاں ہاتھ لہرا کر روانہ ہو جاتا تھا۔ حسین احمد کو اس کی یہ ادا بڑی پسند تھی اور وہ اس پر مسکرائے بغیر نہیں رہتا تھا۔ حمید چٹکی کی بجائے تالی بجاتا تھا اور جب وہ اُس کی طرف دیکھتا تھا تو اُس وقت چٹکی بجا دیتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بڑی جلدی واپس دکان پر آجائے گا۔

روز بروز یہ بے تکلفانہ روابط بڑھتے جارہے تھے۔

حسین احمد جب تک اپنی چار دیواری کے اندر رہتا تھا۔ اُسے گھٹن سی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ زینب اُسے کئی بار کہہ چکی تھی کہ "بھجان تم دکانداروں کے ذکر بن گئے ہو۔ لوگ باتیں بناتے ہیں گھر میں آرام سے بیٹھا کرو۔" مگر وہ اُس کے جواب میں ہوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا اور زینب کچھ مایوس ہو جاتی۔ اصل میں اُس کے لیے بھی ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ حسین احمد کی عدم موجودگی میں زینب کے بچے ماں کی نظر بچا کر نیچے چلے جاتے تھے اور حسین احمد کی چیزوں کو خراب کر دیتے تھے۔ حسین احمد اِس کی شکایت کرتا تھا تو زینب ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہہ دیتی تھی "بھجان نہ جائیں آپ دلمن بچوں کو لاکھ روکو، کہاں مارے باز آتے ہیں۔"

زینب اپنے شوہر کو ناشتا دینے کے بعد عام طور پر حسین احمد کے لیے ناشتا لے کر اس کمرے میں آجاتی تھی۔ کبھی نہیں بھی آسکتی تھی تو وہ زیادہ انتظار نہیں کرتا تھا۔ اپنی ڈیوٹی

پر چلا جاتا تھا۔ وہیں ناشتا کر لیتا تھا۔

اُس روز وہ ابھی چارپائی سے اُٹھا بھی نہیں تھا کہ اسے زینب کے قدموں کی مانوس آہٹ سنائی دی۔

"یہ آج اتنی جلدی کیوں آگئی ہے؟" اُس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔

زینب کے ہاتھ میں معمول کے مطابق ناشتے کی ٹرے نہیں تھی بلکہ ایک لفافہ تھا۔

"بھاجان!"

حسین احمد اُٹھ کر بیٹھ گیا اور نگاہوں سے استفسار کیا کہ کیا معاملہ ہے۔

"یہ تار کل آیا تھا۔ تم گھر میں تھے نہیں۔"

حسین احمد نے لفافہ لے لیا کھولا۔ انگلینڈ سے اُس کے بیٹے الطاف نے بھیجا تھا اور پاکستان میں آنے کی اطلاع دی تھی۔

"الطاف کا ہو گا؟" زینب نے کہا۔

"ہاں۔ آرہا ہے۔"

"آرہا ہے۔ سچ؟"

"تار میں تو یہی لکھا ہے۔"

دوسرا تار الطاف نے کراچی پہنچ کر دیا کہ وہ جمعرات کو شام چھ بجے لاہور ائرپورٹ پر پہنچ جائے گا۔

جمعرات کو پانچ بجے وہ ائرپورٹ میں تھا۔

چھ کی بجائے ساڑھے چھ بجے جہاز نے ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ اور حسین احمد کو آدھ گھنٹہ اور بیٹے کا انتظار کرنا پڑا۔

وہ اپنے بیٹے کے علاوہ چار اور چہرے بھی دیکھ رہا تھا۔

ایک خوب صورت میم۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔

میم ادب اور احترام سے اپنا سر جھکائے اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ بچے اپنے دادا کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بیٹا باپ سے گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر ہونے کے بعد پوچھ رہا تھا۔

"ابا جان! آپ بالکل ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں پتر۔ ٹھیک ہوں۔ آج تیری ماں ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔" حسین احمد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے ابا جان۔"

ائیرپورٹ کے باہر سفید رنگ کی ایک شاندار کار کھڑی تھی۔ یہ الطاف کا ایک دوست الطاف اور اُس کی فیملی کے لیے لایا تھا۔

کار میں بیٹھ کر الطاف باپ سے وہ حالات پوچھتا رہا۔ جو اُس کی غیر حاضری میں اُسے پیش آئے تھے۔ مگر حسین احمد یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ کار شہر کے اندر جانے کی بجائے کہیں اور جا رہی تھی اور جس راستے پر جا رہی تھی۔ اُس سے وہ واقف نہیں تھا۔ شہر میں وہ بہت کم گھوما پھرا تھا اور نئی آبادیوں کے معاملے میں تو بالکل کورا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد کار ایک شاندار ہوٹل کے وسیع پورچ میں رُک گئی۔

"ابا جی" الطاف کار سے اُترتے ہوئے بولا "جب تک رہائش کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا میرا قیام یہیں رہے گا۔"

"ہوٹل میں؟"

"ہاں ابا جی۔"

"مگر الطاف اپنا گھر۔"

"اب اُس گھر میں کون جاتا ہے انکل! آپ کا بیٹا ڈاکٹری کی بڑی ڈگریاں لے کر آیا ہے وہاں رہنا اس کی شان کے خلاف ہے۔" الطاف کی بجائے اُس کے دوست نے وضاحت کی۔

"میں گھر آؤں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو سخت بزی ہوں۔ آنٹی زینب سے کہہ دیں

میں آؤں گا۔"

کمرے میں داخل ہوتے ہی الطاف نے ٹیلی فون سنبھال لیا اور آدھ گھنٹے کے بعد لوگ آنے لگے۔

قہقہے، مبارکبادیں، بے تکلفانہ گفتگو، معانقے، مصافحے، حسین احمد ایک طرف بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے اس طرح فراموش کر دیا گیا تھا۔ جیسے وہ ایک زندہ انسان نہیں، کمرے کے فرنیچر کا کوئی حصہ ہے۔ جیسے صوفہ سیٹ، میز، دیوار پر لگی ہوئی کوئی تصویر، ٹیبل لیمپ۔ اُسے یہ ماحول اجنبی سا، غیر مانوس سا لگ رہا تھا۔ بیرا بار بار چائے لے کر آ رہا تھا۔ نئی ٹرے آتی تو الطاف باپ سے پوچھتا۔

"چائے چلے گی ابا جی؟"

"نہیں۔ بہت پی چکا۔"

ابا جی کے لفظ پر الطاف کا نیا آنے والا دوست حسین احمد پر ایک نظر ڈال کر سلام کے انداز میں اپنا سر ذرا خم کر دیتا اور پھر خالی صوفے پر بیٹھ جاتا۔ شام تک یہی گہما گہمی رہی۔

بیٹے نے یہ محسوس کر لیا کہ باپ بور ہو رہا ہے۔ کرسی سے اُٹھ کر اُس کے قریب آیا۔

"ابا جی۔ آپ کچھ۔"

باپ نے سمجھ لیا کہ بیٹا کسی خدشے کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

"ہاں الطاف تم اپنے دوستوں سے ملو۔ میں کیا کروں گا یہاں بیٹھ کر۔"

"کھانا کھا کر جائیے گا۔"

حسین احمد اُٹھ بیٹھا۔

"نہیں۔ میں رات کا کھانا دیر سے کھاتا ہوں، بس اب مجھے جانے دو۔"

وہ دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ الطاف کے سارے دوست اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"میرا احترام کر رہے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اُس کے سینے میں خوشی اور فخر کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن جب وہ الطاف کے دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر جا رہا تھا تو یہ لہر نہ جانے کیوں ڈوب گئی تھی اور اس کی بجائے ایک مبہم سی افسردگی اُس کے ذہن پر چھا گئی تھی۔

زینب نے اُسے تنہا گھر کی طرف آتے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔

"بھائی جان! الطاف نہیں آیا؟"

حسین احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آیا ہے؟" زینب کا دوسرا سوال تھا۔

"ادھر آئے گا۔ بہت سے دوست آ گئے تھے۔ انھیں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ آئے گا۔ میں نے کہا نا۔"

زینب خاموش رہی۔ حیرت اور استفسار کی ملی جلی کیفیت میں اُسے دیکھتی رہی اور جب اُسے اُس کا بھائی جان مزید کچھ کہنے سُننے کے موڈ میں نہیں تو اُس نے اپنا سر اس انداز سے جھٹک دیا کہ جیسے کہہ رہی ہو "تمہاری مرضی"۔

زینب کے جانے کے بعد اُس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور خود کو چارپائی پر گرا دیا۔ اچانک اُسے اپنی بیوی یاد آ گئی اور اُس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں دیر تک وہ بیوی کی یادوں میں گُم صُم لیٹا رہا۔ اور پھر سو گیا۔

صبح اُس کی آنکھ اُس وقت کھلی جب سورج طلوع ہو کر اپنی روشنی کھڑکی کے راستے اُس کے کمرے میں پھیلا چکا تھا۔ اُس کی طبیعت کسل مند تھی۔ اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا تو وہ گرم تھا۔

ایک ہفتہ وہ بخار میں مبتلا رہا۔ بخار کی شدت میں کمرے سے باہر ہی نہ نکل سکا۔ آٹھویں روز اُس کی طبیعت بحال ہوئی تو الطاف آ گیا۔

دو گھنٹے اُس نے اپنے پُرانے مکان میں گزارے اور جب جانے لگا تو باپ سے کہنے لگا۔

"ابا جان! میں نے کوٹھی خرید لی ہے۔ چلئے میرے ساتھ۔"

"میں یہاں ٹھیک ہوں بیٹا! آخر مجھے یہاں کیا تکلیف ہے۔"

"تکلیف کی بات نہیں ابا جان! میں واپس آگیا ہوں تو آپ تنہا کیوں رہیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ کی عمر کا یہ حصہ بڑے آرام اور سکون سے گزرنا چاہیے۔" اور الطاف باپ کو کار میں بٹھا کر اپنے ہاں لے گیا۔

ایسی خوب صورت کوٹھی اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ نہایت اعلیٰ قسم کا ساز و سامان خدمت کے لیے ایک چھوڑ کئی نوکر، اُسے تنکا توڑنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے دل میں ایک خواہش نے سر اُٹھایا اُسے اپنا پرانا ماحول اپنے ساتھی یاد آنے لگے۔ راتوں کو سونے سے پیشتر اُس کو تنہائی کے لمحے میسر آتے تو وہ واپس اپنی دُنیا میں چلا جاتا جہاں اس نے خوشی بھرے دن گزارے تھے۔ جہاں بشیر تھا اور ارشد تھا، ابراہیم، صمد اور افضال تھے۔ جہاں دو رویہ پرانے مکان دُور تک کھڑے تھے۔ یکایک شرارت سے دمکتے ہوئے چہرے اس کے چاروں طرف روشنی سی بکھیرنے لگتے۔ اور وہ پلنگ پر کروٹیں بدلنے لگتا۔

دن بیت رہے تھے اور اپنی دنیا میں واپس جانے کی خواہش اُس کے اندر بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنی اس آرزو کا اظہار وہ کسی سے کر بھی نہیں سکتا تھا۔

"الطاف بیٹا!" اُس دن اُس کے بیٹے کو ذرا فرصت تھی۔

"جی ابا جان! کیا بات ہے؟"

"وہ ۔۔ بیٹا! میں ذرا اُدھر ۔۔ جانا چاہتا ہوں۔"

"اُدھر کہاں ابا جان؟"

"اُ۔ د۔ دھر۔ اپنے محلے میں۔"

"کیا کریں گے وہاں جا کر؟" بیٹے نے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے اپنے ساتھی یاد آ رہے ہیں۔"

الطاف دو تین لمحے سوچ کر بولا۔

"ابا جان! میں آپ کو روک تا نہیں ہوں — جی چاہتا ہے تو چلے جائیے۔" اور الطاف نے ڈرائیور سے کہہ دیا۔" ابا جان کو لے جاؤ۔"

کار شاداب سڑکوں سے گزر کر گرد و غبار سے اَٹے ہوئے راستے پر آگئی اور پھر وہی مکان، وہی رنگ، وہی نیم تاریک فضا۔

وہ کار سے اتر پڑا اور جب ایک طرف چلنے لگا تو اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

وہ لمبی گلی ویسی کی ویسی تھی۔ وہی اس کی رونق تھی — اسی طرح لوگ گھروں سے نکل رہے تھے — گھروں کے اندر جا رہے تھے۔

دروازوں پر دستک دی جا رہی تھی۔ دریچیں ذرا سا ہٹا کر بوڑھے، جوان، نوعمر چہرے جھانک رہے تھے۔

ایک بچی فٹ بال لے بھاگ رہی تھی اور اُس کا بھائی اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔

سامنے — دُور — ایک تخت بچھا ہوا تھا — جو خالی نظر آ رہا تھا۔

گاہک دُکانوں کے سامنے کھڑے تھے۔

اس کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی — اس کے کانوں میں بیک وقت کئی آوازیں گونجنے لگیں — اس روشنی میں ایک عجیب راحت تھی، ان آوازوں میں ایک ناقابلِ بیان مٹھاس تھی۔

ایک انجانی خوشی اسے آگے ہی آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہی تھی، اور وہ چلا جا رہا تھا۔ تخت پر نگاہیں جمائے ہوئے۔ ان نظروں سے بے خبر جو اس کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں۔ پہلی دکان افضال درزی کی تھی۔ وہ سر جھکائے مشین چلا رہا تھا۔

وہ رُک گیا۔ افضال نے اُسے دیکھا۔ مشین کی ہتھی چھوڑ کر باہر آ گیا۔

"آئیے حسین احمد صاحب۔"

اُسے محسوس ہوا کہ ایک اجنبی آواز اُس کے ذہن سے آ کر ٹکرائی ہے۔

اُسے دیکھ کر ابراہیم، صمد، بشیر اور ارشد بھی اپنی اپنی دکانوں سے نکل کر آ گئے۔

کسی چہرے پر کوئی شرارت کا رنگ نہیں تھا۔ کوئی چہرہ اپنائیت کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ وہ سب ادب اور احترام سے بول رہے تھے۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے حسین احمد جی!"

"کیا حال ہے آپ کا؟"

"کوئی خدمت ہمارے لائق۔"

یہ کون لوگ ہیں۔ جو اس طرح مجھ سے میرا حال پوچھ رہے ہیں۔ کیا یہ وہی ساتھی ہیں میرے، جو گھڑی گھڑی میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ مجھے "گنجو" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہی تو ہیں مگر انھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا انہوں نے مجھے پہچانا نہیں ہے؟

اور وہ اپنے پُرانے تخت پر جا بیٹھا۔ سب اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔

"رستم! گرم چائے لاؤ۔"

گرم چائے میرے لئے۔ وہ کیوں۔ پہلے تو ان میں سے کسی نے ایسا تکلف نہیں کیا تھا اُس کے ارد گرد ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ پوچھنا چاہتا تھا یارو تم نے مجھے پہچانا بھی ہے۔ مگر ہر بار یہ آواز اس کے باطن سے اُٹھ کر وہیں جذب ہو جاتی تھی۔

"یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ اپنے پرانے محلے میں آئے ہیں۔"

نہ جانے یہ الفاظ کس نے کہے تھے۔

وہ جھنجھلا اُٹھا۔

"یارو!" اُس نے اپنا دایاں ہاتھ لہرایا۔

"مجھے جانتے ہو، میں کون ہوں؟"

چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا، پھر ایک آواز اُٹھی۔

"ہاں — آپ شہر کے ایک بڑے ڈاکٹر الطاف احمد کے ابا جان ہیں۔"

یہ آواز ایک بھاری پتھر بن کر اس کے اُوپر گر پڑی۔

پھر سیاہ بادل اس کے اوپر چھا گئے۔ اور ان سیاہ بادلوں کے اندھیارے میں وہ بھاری قدم اُٹھا کر لمبی گلی سے باہر نکلنے لگا۔

جمعہ کی شام

"خدا جب دیتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔" جس شخص نے پہلی مرتبہ اس طرح سوچا تھا اور اپنی سوچ کو الفاظ میں منتقل کیا تھا اُس نے حقیقتاً غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ اس کا مشاہدہ درست تھا۔ اِس کی صداقت اِس مثال سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

پُرانے چغتائی میڈیکل سٹور کا مالک آج سے بارہ برس پیشتر ایک ٹُٹپُونجیا معمولی دوا فروش تھا۔ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر جو کچھ بڑی محنت سے کماتا تھا اُس سے اُس کے چھوٹے سے کنبے کا بھی بڑی تنگدستی سے گزارا ہوتا تھا اور یہ کنبہ اس کے، اس کی بیوی اور دس برس کی اکلوتی بیٹی پر مشتمل تھا۔ اُس کی دُکان گلی کی نکڑ پہ تھی جس میں دوائیں رکھنے کے لیے صرف تین الماریاں ہوتی تھیں اور ان میں سے بھی ایک عام طور پر آدھی خالی ہی رہتی تھی۔

پھر یکایک وہ واقعہ پیش آ گیا جس نے اِس مشاہدے کی مکمل طور پر تائید کر دی۔

ہُوا یہ کہ انور چغتائی شہر کے ایک مضافاتی حصے میں اپنے ایک قدرے خوشحال دوست کے ہاں اُس کے لڑکے کی شادی میں شریک ہوا۔ وہاں اس نے اپنے ایک بہت پرانے دوست سلامت علی کو پہچان لیا۔

سلامت پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک اُس کا ہم جماعت رہا تھا۔ میٹرک کے بعد انور کے باپ نے بیٹے کو اپنی دُکان میں کام کرنے پر لگا لیا اور سلامت علی اپنے ماں باپ کے ساتھ بیرونِ ملک چلا گیا۔

دونوں ایک دوسرے بے خبر ہو گئے۔

بارہ برس بیت گئے ۔ انور کا والد فوت ہو گیا اور وہ تنہا دکان میں کام کرنے لگا چند سال بعد اس کی شادی ہو گئی اور وہ ایک بچی کا باپ بھی بن گیا۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کا کوئی بچپن کا دوست سلامت علی بھی تھا۔

دوست کے لڑکے کی شادی کے موقع پر اُس نے سلامت علی کو دیکھا تو سلامت علی نے اپنے پرانے دوست کو پہچان لیا اور فوراً بڑی گرم جوشی کے ساتھ اُس سے بغل گیر ہو گیا۔ مگر اب سلامت علی امریکا سے لاکھ پتی نہیں کروڑ پتی بن کر لوٹا تھا اور شہر میں ایک بہت بڑے وسیع کاروبار میں مصروف تھا۔

سلامت علی نے اپنے بچپن کے دوست کو جس کے ساتھ اُس نے زندگی کے خوشگوار شب و روز گزارے تھے، مفلوک الحال پایا تو اس کے دل میں ہمدردی کا سچا احساس تڑپ اُٹھا اور اس نے دوسرے روز اسے اپنے ہاں چائے پر بُلا لیا اور یہ دوسرا روز ہی وہ دن تھا جب خدا نے چھپر پھاڑ کر انور چغتائی کو وہ کچھ دیا تھا جس کا خواب بھی اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

سلامت علی شہر میں سب سے بڑا میڈیکل سٹور قائم کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دواؤں سے بھی واقف ہو اور جو بھی ایمان دار انور چغتائی اس کے مقررہ معیار پر پورا اترتا تھا۔ اس نے طالب علمی کے زمانے میں اُسے ایماندار، صداقت شعار اور محنت کش دیکھا تھا اور عملی زندگی میں اس کے ایماندار ہونے کا یہ ثبوت مل گیا تھا کہ اُس نے آٹے میں نمک کے برابر نفع کمانے کے اصول کو اپنا لیا تھا ورنہ کاروبار میں گھپلا کر کے ہزاروں میں کھیل سکتا تھا۔

سلامت نے اپنی تجویز اس کے سامنے رکھی اور شدید اصرار کیا کہ وہ اس کے منصوبے میں شریک ہو جائے۔

انور نے بڑے انکسار کا اظہار کیا۔ اپنی نا اہلی کو بطور دلیل کے پیش کیا مگر سلامت علی جو کچھ کہہ چکا تھا اس میں کسی قسم کی ترمیم پسند نہیں کرتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا کہ انور شہر کے سب سے بارونق مقام پر ایک شاندار میڈیکل سٹور کے انچارج کے طور پر اپنی ذمے داریاں پوری کرنے لگا۔

محنت مشقت کا تو وہ شروع سے ہی عادی تھا۔ ایمانداری اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کاروبار پھیلنے لگا۔ پھیلتا چلا گیا۔ پہلے ایک سٹور تھا پھر مختلف مقامات پر دو اور سٹور کھل گئے۔ اور ان تینوں سٹوروں کی نگرانی وہی کرتا تھا۔

چغتائی میڈیکل سٹور کے مالک کی حیثیت سے وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک چھوٹے سے کرایے کے مکان میں رہتا تھا۔ سلامت علی میڈیکل سٹور میں پہنچا تو اس کے مہربان دوست نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ کرایے کے ایک بہت معمولی مکان میں رہے۔ چنانچہ اس نے اُسے ایک اچھی خاصی رقم ایک بارونق، ترقی یافتہ اور شاداب علاقے میں اچھا سا مکان خریدنے کے لیے قرض کے طور پر دے دی جس کی ادائیگی بڑی آسان اقساط میں ہوتا تھی۔

اپنی زندگی کے خوشحال دور میں انور نے اپنی خوبیوں میں تو کوئی کمی نہ آنے دی۔ وہ پہلا سا محنتی اور دیانتدار ہی رہا لیکن جز رس ضرور ہو گیا۔ بہت بُرے دن دیکھے تھے اُس نے، ایک ایک پیسہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتا تھا۔

اولاد ایک ہی تھی۔ سیماں بی بی جو فارغ التحصیل ہو چکی تھی۔ بیٹی یا بیٹا تعلیم سے فارغ ہو جائے تو ماں باپ کو ایک ہی فکر ہوتی ہے لڑکا ہے تو برسرِ روزگار ہو جائے اور لڑکی ہے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دئیے جائیں۔

سیماں بی بی کی شادی اُس کے والدین کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ شکیل احمد سیماں کی امی زینت بیگم کی ایک رشتے کی بہن کا بیٹا تھا۔ سیماں اور شکیل نہ صرف بچپن کے ساتھی تھے بلکہ ایف اے تک انہوں نے تعلیم بھی ایک ہی کالج میں پائی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ اس محبت کا علم دونوں کے ماں باپ ہی کو نہیں، ان کے عزیزوں کو بھی تھا اور سیماں اور شکیل کی شادی کے لیے ان کے والدین ایک اچھے اور مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

شکیل ایک مقامی دفتر میں سینئر کلرک تھا۔ آمدنی معقول نہیں تھی مگر اتنی خوبیوں کا مالک تھا کہ انور چغتائی کو خود دولت مند ہونے کے باوجود اسے اپنا داماد بنانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا

شکیل ہر جمعہ کی شام سیماں کے یہاں گزارتا تھا۔ سائیکل پر آتا تھا اور دروازے پر پہنچتے ہی سائیکل کی گھنٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کر دیتا تھا۔ سیماں جو سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اس کی منتظر رہتی تھی۔ اپنا ہر کام چھوڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی تھی اور مسکراہٹوں کے جھرمٹ میں اس کا خیر مقدم کر کے کمرے کے اندر لے آتی تھی۔

اُس شام دروازے کے باہر سائیکل کی گھنٹی بجی تو سیماں نے معمول کے مطابق بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ شکیل اندر آیا تو زینت بیگم اپنی نوکرانی کو چائے بنانے کے لئے کہہ رہی تھی وہ ہمیشہ اپنے ہونے والے داماد کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی ———— اس روز بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور آئی مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ مسکراہٹ مصنوعی ہے اور ازراہِ تکلف چہرے پر لائی گئی ہے۔

شکیل اور سیماں کرسیوں میں بیٹھ گئے تو زینت بیگم کرسی سے اٹھ کر جانے لگی اور ایک منٹ بعد وہ اپنے شوہر کے کمرے میں آہستہ آہستہ اُس کی طرف قدم اٹھا رہی تھی۔

انور جمعہ کی شام کو ضروری فائل گھر لے آتا تھا اور بقیہ کام اپنے کمرے میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر کرتا تھا۔

اُس کی نظر نے بیوی کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے کام میں منہمک تھا۔ زینت خاموشی سے اس کے سامنے کرسی میں بیٹھ گئی۔

"کیا دو تین منٹ نکال سکیں گے میرے لیے؟"

بیوی کی آواز سن کر انور نے فائل بند کر دی۔

"کوئی ضروری بات ہے کیا؟"

"ضروری نہ ہوتی تو آپ کے کام میں مداخلت کیوں کرتی؟"

انور نے ریوالونگ چیئر کو ذرا گردش دی اور بیوی کے بالکل سامنے آگیا۔

"معاملہ کیا ہے بیگم؟"

"ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔"

بیوی کے ہونٹوں سے یہ بات سن کر انور مسکراتے لگا "کیا آج مجھے یہ اطلاع دی جا رہی ہے؟"

زینت بھی بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ ویسے تو بیٹی کی شادی ہمارے لیے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ شادی انشاءاللہ بڑی کامیاب ہوگی مگر۔۔"

"یہ اگر مگر کیا؟"

انور نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی بیوی کسی الجھن میں گرفتار ہے اور اس کے اظہار کے لیے آئی ہے۔

"صاف صاف کہو الجھن کیا ہے تمہارے ذہن میں۔"

"دیکھو سیاں کے ابا۔" زینت نے فقرہ مکمل کرنے سے پہلے اپنا چہرہ شوہر کے قریب تر کر دیا۔ "شکیل اچھا لڑکا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ ہماری بیٹی کا منگیتر ہے۔ یہاں آس پاس جتنے معزز لوگ رہتے ہیں انھیں بھی یہ بات معلوم ہے۔"

انور نے بیوی کو ذرا غور سے دیکھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری الجھن کیا ہے۔ کیا یہ الجھن ہے کہ آس پاس کے معزز لوگوں کو سیاں کے منگیتر کا علم ہے؟"

"یہ الجھن ہرگز نہیں۔ اصل میں ہماری موجودہ سوسائٹی میں سٹیٹس کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ شکیل عام سے کپڑے پہن کر سائیکل پہ آتا ہے۔ سائیکل بھی کوئی اچھی سواری ہے؟"

انور نے اس انداز سے سر کو جنبش دی جیسے وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔

"بیگم! وہ ایک سینئر کلرک ہے۔ سائیکل ہی خرید سکتا ہے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔"

انور نے اس خیال سے کہ زینت جس توقع کو لے کر آئی ہے وہ بیان نہ کر دے، بڑے اعتماد لہجے میں کہا: "زینت بیگم! تم جانتی ہو میں ایک با اصول آدمی ہوں۔ روپیہ پیسہ خرچ ضرور کرتا ہوں مگر اپنے

اصول کے مطابق: "ہر شخص کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ میں اس اصول کا قائل ہوں۔" یہ کہتے ہوئے انور نے بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کیفیت کو تلاش کیا جو الفاظ بن کر اس کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والی تھی مگر اُس نے اسی لمحے محسوس کر لیا کہ وہ اس حد تک مایوس ہو گئی ہے کہ کچھ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ اپنی فتحیابی کے احساس پر مسکرا کر بولا۔

"بیگم وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں چائے پر۔ چلنا چاہیے۔"

"ہوں۔ بہتر۔" یہ لفظ اس نے اس انداز میں کہے جیسے کوئی آدمی عالمِ غنودگی میں ہو۔

چائے پی گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور جب شکیل جانے لگا تو زینت نے آہستہ سے اُسے کہا: "کل شام آجانا۔ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" شکیل نے "اچھا" کہہ کر اجازت لی اور دروازے پر سیماں کو خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

زینت بیگم دوسری شام سیماں کو شکیل کے آنے کی خبر دیئے بغیر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ اُس وقت سیماں باورچی خانے میں مصروف تھی۔

"دیکھو بیٹا شکیل! میں تنہائی میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی اس لیے تمہیں تکلیف دی ہے۔"

"تکلیف کیسی خالہ جان! یہ میرا فرض تھا۔ حکم کیجئے کس لیے بلایا ہے۔ حاضر ہوں۔"

زینت کچھ سوچنے لگی شکیل استفسار طلب نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"شکیل بیٹا۔"

"جی، فرمائیے۔"

"وقت بدل جاتا ہے تو اُس کا تقاضا بھی بدل جاتا ہے۔ سمجھتے ہونا۔"

"بالکل درست فرمایا ہے آپ نے۔"

"تو بیٹا! اب تم ایک چھوٹی سی دکان چغتائی میڈیکل سٹور کے مالک انور چغتائی کے داماد نہیں ہو۔ بلکہ شہر کے تین بڑے میڈیکل سٹوروں کے جنرل منیجر انور چغتائی کے داماد ہو۔ سمجھ لیا۔"

"خالہ جان یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ بہت بڑی عزت ہے۔"

"تو بیٹیا! اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی پہلے شکیل نہ رہو۔"

"جی میں کچھ سمجھ نہیں سکا خالہ جان۔"

زینت ہنس پڑی۔

"میری مراد یہ نہیں ہے کہ تم بدل جاؤ شکیل سے کچھ اور بن جاؤ۔ میں چاہتی یہ ہوں کہ اب تمہاری ظاہری صورت میں فرق آجانا چاہیے۔ یہاں بڑے معزز لوگ رہتے ہیں۔ وہ تمہیں ہمارے یہاں آتے جاتے دیکھتے رہتے ہیں۔"

شکیل نے بے تابی سے کہا۔

"خالہ جان! ہم تو ۔ میرا مطلب ہے میں اور سیماں ۔"

"ارے بیٹیا! صبر سے بات تو پوری سن لی ہوتی۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ تم یہاں آنا جانا چھوڑ دو۔ انور صاحب کو ذرا فرصت ملتی ہے تو ہم اپنا فریضہ ادا کئے دیتے ہیں۔"

"تو خالہ جان!" شکیل کے لہجے سے پہلی سی گھبراہٹ دور ہو گئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنا سٹیٹس اونچا کرو۔ کیونکہ تم اب ایک بہت بڑی فرم کے جنرل منیجر کے داماد ہو۔ خود سوچو یہ لباس مناسب ہے۔"

شکیل غیر شعوری طور پر اپنے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"یہ لباس گھر میں ٹھیک ہے مگر یہاں آتے وقت یہ نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھ لیا نا۔"

"سمجھ لیا جی۔"

"لباس میں بڑی شان ہوتی ہے بیٹیا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے اور اب آؤں گا تو آپ مجھے اس لباس میں نہیں پائیں گی۔ میری کمیٹی نکلنے والی ہے۔"

"ماشاء اللہ بہت ذہین اور سمجھدار بیٹے ہو۔ ہاں سنو۔ سیماں سے ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا سمجھے۔"

"جی ہاں سمجھ لیا ہے ۔ اب اجازت چاہتا ہوں ۔ سیماں سے ملتا بھی نہیں۔"

شکیل اور اس کی ہونے والی ساس کے درمیان گفتگو ہفتے کے روز ہوئی تھی ۔ پانچ روز بعد جمعہ کی شام آئی تو شکیل نہ آیا ۔ سیماں آزردہ ہو گئی اور اس کی ماں کے ذہن میں ایک سوال ابھر آیا ۔ کیا شکیل اس وجہ سے تو نہیں آیا کہ اس نے اسے اپنا لباس تبدیل کرنے کے لئے کہا تھا ۔ مگر یہ تو اس کی اپنی بہتری کے لیے تھا ۔ آخر وہ ایک بڑے آدمی کا داماد ہونے والا ہے ۔ لوگ اس لباس میں اسے دیکھ کر دل میں ہنستے ہوں گے ۔

سیماں خاموش گھر کے کاموں میں مصروف رہی اور زینت کسی ڈائجسٹ رسالے کا مطالعہ کرتی رہی ۔ دونوں نے آنکھوں کے اشارے سے شکیل کی غیر موجودگی کے احساس کا اظہار کر دیا ۔ اس سے آگے کچھ نہیں ۔ انور اس روز گھر میں تھا ہی نہیں ، کاروباری معاملے میں کراچی چلا گیا تھا ۔

اگلا جمعہ آیا تو شام ہوتے ہی سائیکل کی گھنٹی بجی ۔ ماں بیٹی نے آنکھوں کے اشارے سے ایک دوسرے پر اپنی خوشی کا اظہار کر دیا ۔

شکیل اندر آیا ۔ اس کا لباس بدل چکا تھا ۔ فیلٹ ہیٹ سے لے کر بوٹ تک وہ پہلا شکیل دکھائی ہی نہیں دیتا تھا ۔

سیماں نے اس کا بیش قیمت لباس دیکھا تو اسے حیرت ہوئی مگر اس کی ماں کا ردِ عمل حیرت کے برعکس اطمینان لیے ہوئے تھا ۔

اس روز سیماں اپنے خیال میں کچھ الجھی الجھی رہی اور زینت کا رویہ زیادہ تر مشفقانہ رہا ۔ انور اس سلسلے میں بالکل غیر جانب دار رہا ۔ اس کی نظروں میں شکیل کے نئے خوب صورت اور شاندار لباس کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ اس کا ردِ عمل کچھ ایسا تھا ۔ "تم نے اچھا لباس پہن لیا ہے ٹھیک ہے۔"

شکیل جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ سیماں کی ایک سہیلی آگئی اور وہ اپنی سہیلی کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ انور کو کہیں باہر جانا تھا ، وہ چلا گیا ۔

" ٹھہرو ایک منٹ ۔"

شکیل رُک گیا۔ "جی خالہ جان حکم؟"

"بیٹیا! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ یہ لباس تمہارے لیے بالکل مناسب ہے مگر ــــ دیکھونا بیٹیا۔"

"فرمایئے خالہ جان کہتے کہتے رُک کیوں گئیں؟"

"وہ ــ لباس تو تم نے بدل لیا۔ لیکن یہ جو بائیسکل ہے نا تمہاری۔"

"جی۔"

"بیٹیا کیا کہوں۔ خود ہی سمجھ جاؤ۔ ماشاء اللہ چشم بددور ایک بڑے آدمی کے داماد ہو۔ سائیکل کچھ جچتی نہیں ہے۔ سمجھ لیا نا؟"

شکیل دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"جی سمجھ لیا ہے خالہ جان ــ پوری طرح سمجھ لیا ہے۔"

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی میرا بیٹا شکیل بڑا سمجھدار، سوجھ بوجھ والا ہے۔"

"اچھا خالہ جان اب چلتا ہوں۔"

زینت نے بڑی شفقت سے شکیل کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کیا۔

اگلے جمعے کی شام کو سائیکل کی گھنٹی کی بجائے موٹر سائیکل کا ہارن بجا تو زینت ایک دم کھل اٹھی۔ اِس سے پیشتر کہ سیماں اٹھ کر جاتے زینت خود دروازے پر پہنچ گئی۔

"اللہ رکھے میرے پیارے بیٹے کو۔ ماں کی عزت رکھ لی ہے۔"

"زینت دروازے کے سامنے نیا موٹر سائیکل دیکھ کر نہال ہو گئی۔

اُس شام اُس نے شکیل کی خاص طور پر خاطر مدارت کی اور سیماں کو موٹر سائیکل پر ساتھ بیٹھ کر سیر کی اجازت بھی دے دی۔ اصل میں اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جو اِس سے پہلے شکیل کی سائیکل دیکھتے رہے ہیں۔ آج موٹر سائیکل بھی دیکھ لیں۔

اب شکیل موٹر سائیکل پر ہی آتا تھا اور ہر بار سیماں کو سیر کرانے لے جاتا تھا۔

ایک شام زینت کچھ ملول سی دکھائی دی۔

"کیوں خالہ جان؟ شاید آپ کچھ ملول ہیں۔"

"چھوڑو بیٹا۔ بس اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

"پھر بھی۔ خالہ جان؟"

"بیٹا! میں چاہتی تو یہ ہوں کہ دل میں بات نہ رکھوں۔ تم غیر تو ہو نہیں، میرے بیٹے ہو۔ تم سے کیا پردہ!"

"کوئی پردہ نہیں خالہ جان! بتائیے۔"

زینت ذرا توقف سے بولی۔

"شکیل۔ میرے بیٹے۔ تم معمولی لڑکے نہیں ہو۔"

"خالہ جان! میں ایک معمولی لڑکا ہی ہوں مگر بڑا ہوں بن گیا ہوں کہ ایک بہت بڑے شخص نے مجھے فرزندی میں قبول کر لیا ہے۔"

زینت کی آنکھوں سے مسکراہٹیں جھلکنے لگیں۔

"اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری ہر چیز ایسی ہو جس سے تمہاری شخصیت میں اضافہ ہو۔ سمجھے۔"

"جی سمجھ لیا۔"

"ماشاءاللہ ذہانت ہو تو ایسی ہو۔ بیٹا شکیل یہ موٹر سائیکل عام ہو گئی ہے۔ گاڑی۔ میرا مطلب سمجھ لیا نا۔"

شکیل نے سر جھکا لیا اور جب اٹھا تو کہنے لگا۔

"خالہ جان! آپ نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست ہے۔ میں اس سلسلے میں جلد ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔"

جمعہ کی وہ شام پندرہ دن کے بعد آئی تھی۔

شکیل اپنے گھر کے باہر جھاڑن سے موٹر سائیکل صاف کر رہا تھا کہ سیاہ چمکتے ہوئے رنگ کی گاڑی اس کے قریب آ کر رک گئی۔

شکیل کے کانوں میں ہارن کی آواز آئی تو اس نے دائیں جانب دیکھا۔ انور چغتائی گاڑی سے باہر نکل رہا تھا۔

"کہو شکیل! کیا حال ہے؟"

"آپ انکل؟" شکیل اُسے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"میں بہت ہی مصروف رہتا ہوں۔ تم سے بڑی مختصر ملاقات رہتی ہے۔ آج کچھ فرصت تھی۔ سوچا تھوڑا سا وقت شکیل کے ساتھ گزار لیا جائے اِس لیے چلا آیا۔"

"تو آیئے۔" شکیل نے اپنے گھر کے دروازے کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں نہیں۔"

"تو۔"

"کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر ذرا اچھی فضا میں بیٹھ سکیں گے مدت ہوئی ہے کسی ریسٹورنٹ کی شکل دیکھے ہوئے۔ اسے یہاں رہنے دو۔" انور نے شکیل کی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

شکیل گاڑی میں انور کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

عام، رسمی سی باتیں ہونے لگیں اور گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔

"آؤ شکیل۔"

اور دونوں ریسٹورنٹ میں ایک الگ میز کے سامنے بیٹھ گئے۔

پُرتکلف چائے کے دوران بھی وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ خیر خیریت کے بارے میں استفسار، دفتر میں آگے بڑھنے کا کوئی چانس۔ وغیرہ۔

"ہاں شکیل ایک آدھ بات بھی تم سے کہنا ہے۔"

"جی انکل۔"

"وہ کوئی اتنی اہم تو نہیں۔ تاہم اسے کچھ اہمیت دینا ہی پڑے گی۔ دو روز ہوئے ڈاک سے

ایک خط آیا تھا میری بیگم کے نام۔ بیگم نے اسے پڑھ کر غلطی سے میز کے اوپر ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں اُدھر سے گزرا تو میری نگاہ اس پر پڑ گئی۔ تحریر کا انداز شناسا معلوم ہُوا۔ پہچان لیا کہ تم نے اپنی آنٹی کو خط لکھا ہے۔ آنٹی اور انکل میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے میں نے تمہارا خط پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔"

انور نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو گھور کر دیکھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے الفاظ کا شکیل پر کیا اثر ہُوا ہے۔

شکیل کا رنگ قدرے متغیر ہو گیا تھا۔

"الفاظ پڑھ دوں؟"

شکیل خاموش رہا۔

"یہ خط تم نے میری بیگم کو لکھا ہے۔ میں تمہارے الفاظ دہراتا ہوں۔ محترم خالہ جان! میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کے ہر ارشاد کی تعمیل کروں۔ آپ نے گاڑی کے ملنے کہا تھا میں سمجھتا ہوں۔ آپ کا مطالبہ درست ہے۔ گاڑی کسی نہ کسی طرح خرید لوں گا مگر ایک مشکل ہے۔ میرے چھوٹے سے مکان کے سامنے گاڑی یقیناً مناسب نہیں رہے گی۔ اسے ایک کوٹھی کے سامنے ہونا چاہئے آخر میں ایک بہت بڑی فرم کے جنرل منیجر کا داماد ہوں۔"

انور نے کن انکھیوں سے شکیل کو دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"ہوں۔ کیا کہا ہے تم نے۔ آخر میں ایک بہت بڑی فرم کے جنرل منیجر کا داماد ہوں۔ اگر میں کوٹھی کے لیے کہوں تو۔ خالہ جان! یہ کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جسے خلافِ واقعہ یا غیر مناسب کہا جائے۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔"

انور نے کاغذ سے نگاہیں ہٹالیں اور شکیل کے چہرے پر جمادیں جس نے اب اپنا سر اُٹھا لیا تھا۔

"یہ خط تمہارا ہے؟"

"جی"

"درست۔ میری بیگم نے اس معاملے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی کیونکہ وہ میرے اصولوں سے واقف ہے۔

"انکل۔"

"کہو۔"

"آپ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہیں؟"

"شکیل؟ بھول گئے ہو کہ میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ فرصت کے اِن لمحات میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔"

"تو۔ میرا خیال ہے فرصت کے وہ لمحات ختم ہو گئے ہیں۔"

"وہ ختم ہو گئے ہیں مگر چند لمحے اور صرف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے شکیل! تم میری پچھلی زندگی سے بے خبر نہیں ہو۔ مگر اس بات سے شاید واقف نہیں ہو کہ میں اُس وقت جو تھا وہی تھا جو لوگ مجھے دیکھتے تھے۔ اب جو ہوں وہی ہوں جس سے سب واقف نہیں۔ اُس زمانے میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور آج بھی اپنے ہی پاؤں پر کھڑا ہوں محنت کرتا تھا انور چغتائی میڈیکل سٹور کا مالک بن گیا۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ بہت محنت کی جنرل مینجر بن گیا۔"

انور نے روانی سے یہ سب کچھ کہہ دیا۔

"میں کسی کو بھی نصیحت نہیں کرتا۔ نصیحت کرنے سے مجھے نفرت ہے ویسے میں سمجھتا ہوں انسان وہی کچھ ہے جو دراصل وہ ہے۔ یا اُسے وہی کچھ ہونا چاہیے جو وہ ہے۔"

انور کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔ بیرا بل لے آیا۔ اس نے ادائیگی کر دی۔ شکیل بھی کھڑا ہو چکا تھا۔

"تم میرے گھر چلو گے یا اپنے گھر۔ ڈراپ کر دوں گا۔"

"چلا جاؤں گا۔ تھینک یو سَر۔"

"AS YOU LIKEIT"

اور انور تیزی سے چلا گیا

کئی جیسے بیت گئے تھے۔ انور اپنی کاروباری مصروفیات میں بہت طرح اُلجھ گیا تھا۔ وہ دیر سے رات کو آتا تھا اور آتے ہی سو جاتا تھا۔ شام کی چائے زینت اور بیہاں ہی پیتی تھیں۔

وقفے وقفے سے سیماں دروازے پر نگاہ ڈال کر فوراً کپ ہونٹوں سے لگا دیتی تھی۔

زینت پوچھتی تھی۔

"پتا نہیں شکیل کیوں نہیں آیا۔"

"پتا نہیں امی"۔ سیماں کا مختصر جواب ہوتا تھا۔

اور وہ جمعہ ہی کی ایک شام تھی۔ انور اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی چائے کمرے ہی میں منگوالی تھی۔

زینت اور سیماں کے آگے چائے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ یکایک سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔

زینت کی نظریں سیماں کی نظروں سے ملیں۔ دونوں کی نگاہیں بے زبان خاموشی پوچھ رہی تھیں۔

"یہ سائیکل ہی کی گھنٹی ہے نا!"

گھنٹی کی آواز پھر آئی۔

دونوں ایک ساتھ اٹھ بیٹھیں۔

دروازے کے باہر شکیل سائیکل لئے کھڑا تھا، وہی سادہ لباس اور وہی پہلا سا انداز کھڑے ہونے کا۔

"شکیل تم؟" زینت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"خالہ جان! انکل نے کہا تھا۔ آدمی کو وہی کچھ ہونا چاہیے جو وہ ہے۔ اور میں بھی کچھ ہوں۔"

"شاباش بیٹا! تم بھی کچھ ہو۔"

انور مسکراتے ہوئے دروازے سے نکل کر شکیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اندر آؤ بیٹا!"

انور نے ہاتھ بڑھا کر شکیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زینت اور سیماں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

رپورٹر

وہ علاقہ جو صرف ایک سال پیشتر ایک انتہائی پس ماندہ گاؤں سمجھا جاتا تھا، حکومت اور لوگوں کی مشترکہ منصوبہ بندی، ایثار اور محنت سے ایک اچھا خاصا ترقی یافتہ قصبہ بن گیا تھا کھنڈرات کی جگہ یک منزلہ، دو منزلہ اور کہیں کہیں سہ منزلہ مکانات سر اٹھائے کھڑے تھے۔ شاندار حویلیاں بھی اپنے مالکوں کے حسنِ ذوق کا ثبوت دے رہی تھیں۔ سڑکیں، تمام کی تمام تو نہیں۔ ان کی معقول تعداد ہر قسم کی ٹریفک کے قابل ہو گئی تھی۔ کھیتوں میں فصلیں لہرا رہی تھیں۔ قصبے کے بعض حصوں میں کچھ مکان اور جھونپڑیاں بھی نظر آ جاتی تھیں مگر ان کے وجود سے قصبے کی مجموعی ترقی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔

قصبے کی مجموعی ترقی میں ایک شخص کا بڑا حصّہ تھا۔ شہر سے اخباروں کے جو رپورٹر اس قصبے میں آنکھوں دیکھا حال دیکھنے گئے تھے انہوں نے چند روز وہاں ٹھہر کر اپنے اپنے اخباروں کو جو رپورٹیں بھیجی تھیں اِن میں اس قصبے کی ترقی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا اور یہی ترقی کا سرچشمہ حاجی رحیم علی کی ذات کو قرار دیا گیا تھا جن کے پوتے کے نام پر اب اِس قصبے کا نام 'خرم آباد' مشہور ہو گیا تھا۔

اخبارات کی رپورٹیں پڑھ پڑھ کر شہروں میں رہنے والے لوگوں کی 'خرم آباد' میں دلچسپی، یعنی کوئی خلافِ توقع بات نہیں تھی۔ وہ سمجھنے لگے تھے کہ خرم آباد اسی طرح بارونق ہوتا چلا گیا تو ایک روز قصبہ نہیں رہے گا، شہر بن جائے گا۔

اخباروں میں خرم آباد کی ہمہ جہت ترقی و فروغ کی روداد وقفے وقفے سے شائع ہو رہی تھیں مگر ایک ہفت روزہ ایسا بھی تھا جس میں اس سلسلے کی کوئی تحریر نہیں چھپی تھی اس ہفت روزہ کا نام صداقت شعار تھا اور اس کے مالک اور ایڈیٹر علی نیاز تھے۔ جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پرچے کا صرف نام ہی صداقت شعار نہیں ہے۔ وہ اپنی پالیسی کے اعتبار سے بھی صداقت شعار ہے۔

تو ایک روز جب پرچے کے آخری صفحات پریس کو بھجوائے جا چکے تھے، علی نیاز کے کمرے میں اُن کے اخبار کا رپورٹر مختار احمد کرسی میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور کنکھیوں سے اخبار کے مالک کو بھی دیکھے جا رہا تھا جو کسی خط کا مطالعہ کر رہے تھے۔

خط پڑھ کر انہوں نے کاغذ تہ کر کے ایک فائل میں رکھ دیا اور رپورٹر سے مخاطب ہوئے۔

"مختار صاحب پڑھنے والوں کو ہم سے کچھ شکایت ہے۔"

"کیا شکایت ہے جناب!"

"کئی روزناموں اور ہفت روزوں میں خرم آباد کی خبریں چھپ چکی ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں چھاپا۔"

"یہ تو درست ہے جناب۔"

"تو کیا سوچتے ہیں آپ!" علی نیاز نے اپنی چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو یہی سوچ سکتا ہوں کہ رپورٹنگ کے لیے وہاں چلا جاؤں۔"

اور علی نیاز نے چائے کا لمبا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اپنے رپورٹر کی سوچ کی تائید کر دی۔

اپنے باس سے گفتگو کرنے اور خرم آباد کے سفر کا پروگرام طے کرنے کے بعد مختار احمد اخبار کی چھوٹی سی لائبریری میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے ایک روزنامے کے وہ شمارے شیلف میں سے نکالے جن میں خرم آباد کے بارے میں کچھ رپورٹیں چھپی تھیں۔

ان رپورٹوں کے مطالعے سے اُس نے ضروری معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ خرم آباد میں ایک سرائے بھی ہے اور ایک ہوٹل بھی۔ اُس نے سوچ لیا کہ وہ سرائے کی بجائے ہوٹل

میں قیام کرے گا کہ وہاں نسبتاً سکون مل سکتا ہے اور سکون کے ساتھ اپنا کام کر سکتا ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق پیر کی صبح کو وہ اپنا سوٹ کیس ایک ہاتھ میں اور دوسرے میں کاغذ یا اور کتابوں کا ایک بنڈل لے کر لاری اڈے کی طرف چل پڑا۔

مقررہ وقت پر لاری روانہ ہو گئی۔

سفر کے دوران میں وہ کسی نہ کسی کتاب کے پڑھنے میں زیادہ وقت صرف کر دیتا تھا۔ اس سفر میں بھی اس نے ایک کتاب کا انتخاب کیا، سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ ورق گردانی کرنے لگا۔

مارچ کے آخری ہفتے کا پہلا دن تھا۔ بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ فضا میں قدرے خنکی تھی کبھی کبھی کتاب سے نظریں ہٹا کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا تو اسے پتوں سے لدی ہوئی پیڑوں کی ڈالیاں ہرے بھرے کھیتوں کی ہریالی اور باغوں میں پھولوں سے لدے ہوئے پودے نظر آ جاتے تھے جو اُسے تر و تازگی کا احساس دے جاتے تھے۔

تین گھنٹے بیت چکے تھے اور ابھی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ یہ باقی سفر اُس نے طرح طرح کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گزارا۔

آخر لاری اڈے پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ خرم آباد کے قصبے میں تھا۔

اپنا سوٹ کیس اور کتابوں کا بنڈل سنبھال کر وہ نیچے اُترا اور ہوٹل کی تلاش میں ایک طرف چند قدم ہی چلا ہو گا کہ اُس نے محسوس کیا کہ دو آدمی اُسے بُری طرح گھور رہے ہیں۔

"کون ہیں؟" اُس کے ذہن میں سوال اُبھرا مگر اس پر غور کرنے یا اپنی جگہ پر رک جانے کی بجائے وہ ایک طرف چلنے لگا جیسے ان سے بے نیاز ہے۔ دو قدم ہی چلا ہو گا کہ بیک وقت دو ہاتھ بڑھے، ایک ہاتھ نے اُس کا سوٹ کیس پکڑنے کی کوشش کی اور دوسرے نے کتابوں کا بنڈل اس کے ساتھ ہی نیلے رنگ کی ٹیوٹا کار اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ ڈرائیور تیزی سے اُترا اور اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

مختار کو اس قسم کے واقعے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ حیرت سے بولا۔

"کون ہیں آپ لوگ؟"

"آپ اخبار 'صداقت شعار' کے دفتر سے آئے ہیں؟" وہ شخص جو مختار کا سوٹ کیس پکڑنے میں کوشاں تھا، ادب اور احترام سے کہنے لگا

"جی ہاں میں صداقت شعار کا رپورٹر ہوں۔"

"تو پھر چلیے۔"

مختار نے ابھی تک اپنی چیزیں ان کے حوالے نہیں کی تھیں۔ بڑھے ہوئے ہاتھ سوٹ کیس اور کتابوں کے بنڈل کو چھو رہے تھے۔

"کہاں چلوں، اپنا تعارف تو کرائیے۔"

"ہمیں سرکار نے بھیجا ہے کہ آپ کو بنگلے میں پہنچا دیں۔ آپ اُن کے معزز مہمان ہیں۔"

"سرکار کون؟"

دونوں ہنس پڑے۔ اُن کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مختار کی بے خبری یا حماقت پر ہنس رہے ہیں۔

"آپ سرکار سے واقف نہیں۔ حاجی رحیم علی صاحب۔ آپ نے یہ نام ضرور سنا ہوگا۔"

"سُنا ہے مگر دیکھیے۔"

مختار اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ ڈرائیور جھٹ بول اٹھا۔

"جناب، خرم آباد میں جو بھی بڑے لوگ آتے ہیں، ہمارے حاجی صاحب انھیں اپنے یہاں ٹھہراتے ہیں۔"

"مگر میں تو بڑے لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔"

"جی آپ ہیں جی۔ اخباروں والے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ سرکار بھی انھیں اپنے مہمان بناتے ہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

"یہ دے دیجیے نا ہمیں گاڑی میں رکھ لیں۔" ایک بولا۔

"میں حاجی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ لیکن میں یہاں کسی کا مہمان بننے کے لیے نہیں آیا۔" مختار کے لہجے سے انکار کے باوجود نرمی کا اظہار ہو رہا تھا۔

تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"مگر یہاں کا یہی طریقہ ہے۔" ڈرائیور نے گاڑی کے دروازے کو پوری طرح کھول دیا تھا۔

"میں اس طریقے پر عمل نہیں کر سکتا"

"لیکن سرکار ہم پر خفا ہوں گے۔"

"ان سے ملاقات ہوگی تو میں خود ہی ان سے معذرت کر لوں گا۔ آپ ان تک میرا شکریہ پہنچا دیں۔"

وہ دونوں ہاتھ سوٹ کیس اور کتابوں سے ہٹا کر آہستہ آہستہ سرک رہے تھے۔

"تو آپ۔۔؟"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ آپ کی مہربانی ہوگی جو آپ مجھے ہوٹل کا پتا بتا دیں۔"

تینوں اس طرح حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ان میں سے کسی نے بھی مختار کی بات سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ مختار انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر چلنے لگا۔

لوگ آ جا رہے تھے۔ سائیکلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ تانگوں کی ۔۔۔ تھی۔ بجلی بتی اور سامان سے بھری ہوئی دکانیں دیکھ کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک نو آباد قصبے میں نہیں۔ اپنے شہر ہی کے ایک بازار سے گزر رہا ہے۔

ایک پنساری کی دکان کے سامنے، ذہن میں اس سوال آ جانے کی وجہ سے وہ رک گیا۔ "ہوٹل ہے کہاں؟" اور اس نے پنساری سے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے ہوٹل کا پتا بتائیں گے؟"

"ضرور۔ ضرور۔ دیکھیے سیدھے چلتے جائیے۔ دائیں طرف ایک پیلی رنگ کی دکان نظر آئے گی۔ اس دکان کے ساتھ جو گلی ہے اس کے آخر میں ہوٹل ہے۔"

مختار نے پنساری کا شکریہ ادا کیا۔ چند منٹ چلنے کے بعد وہ ایک گلی کے اندر داخل

دو منزلہ، پرانی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ عمارت کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا تھا "سنرم ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ۔"

ہوٹل کے ایک چھوٹے سے ہال میں کچھ لوگ چائے پی رہے تھے اور ایک کونے میں، میز کے سامنے ہوٹل کا مالک بیٹھا ایک لمبے سے رجسٹر پر جھکا ہوا تھا۔

"جناب مجھے کمرہ چاہیے۔"

ہوٹل کے مالک نے دو تین لمحے اُسے گھور کر دیکھا۔

"کہاں سے آئے ہیں۔ کیا کام ہے، کب تک قیام کا ارادہ ہے؟" اور مختار سے اپنے ان سوالوں کے جواب سن کر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"آپ اخبار سے آئے ہیں تو سرکار کے مہمان ہوتے۔ کیا ان کے آدمی آپ کو لینے نہیں پہنچے تھے؟"

"پہنچے تھے۔ میں نے معذرت کر لی تھی۔"

مختار نے محسوس کیا کہ نہ صرف ہوٹل کے مالک کی نظریں اُسے حیرت سے دیکھ رہی ہیں دوسرے بھی اسے غور سے تکنے لگے ہیں۔ یہ صورتِ حال اُس کے لیے قدرے پریشان کُن تھی اور وہ جلد اس سے نجات پانا چاہتا تھا اس لئے بولا۔

"میں نے کچھ عرض کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کمرہ خالی ہے۔ اے فرزند" اس نے بلند آواز سے ہوٹل کے بیرے کو پکارا۔

"صاحب کو اوپر سات نمبر میں لے جاؤ۔"

مختار نے رجسٹر پر دستخط کیے اور بیرے کے ساتھ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

عام سا کمرہ تھا۔ فرش ننگا۔ دیواریں بوسیدہ۔ ایک دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی ہوئی۔ پاس ایک میز اور دو تین بانوسی کرسیاں پڑی تھیں۔

"ہوادار کمرہ ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو؟"

مختار نے کتابیں میز کے اُوپر رکھ دیں۔ سوٹ کیس بیرا میز کے نیچے رکھ چکا تھا۔

"میں نہاؤں گا۔ پھر چائے کی ایک گرم گرم پیالی۔"

"ایک غسل خانہ اُوپر بھی ہے۔ سیڑھیوں کے پاس۔ آپ نہا لیں۔ چائے آ جائے گی۔"

بیرے کے جانے کے بعد مختار نے سوٹ کیس میں سے تولیہ اور صابن نکالا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا دھو کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ اُس نے دیکھا ہوٹل کا مالک دروازے کے پاس کھڑا بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ سرکار خود آئے ہیں۔ آئیے نیچے۔"

وہ ہوٹل کے مالک کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں سے اترنے لگا۔

ایک فربہ اندام شخص کرسی میں بیٹھا تھا۔ سر پہ پگڑی، حاجیوں والا رومال دونوں کندھوں پہ پھیلا ہوا۔ خشخشی داڑھی بہت بڑھیا کپڑے، شلوار اور لمبی واسکٹ میں ملبوس۔ ہاتھ میں سُرخ رنگ کی قیمتی چھڑی۔

مختار کو نیچے اُترتے ہوئے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"ارے صاحب! یہ آپ نے کیا غضب کیا ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں ٹھہریں۔ یہ آپ کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور ہمارے ساتھ بھی۔" اس نے ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ کہہ دیا۔

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ جناب حاجی رحیم علی ہیں۔"

"آپ کا خادم۔"

"میں آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"نہیں صاحب زبانی شکریے سے کام نہیں چلے گا۔" حاجی صاحب کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

"حاجی صاحب۔" مختار کہنے لگا۔ "میرے ایڈیٹر صاحب نے مجھے اتنی رقم دے دی ہے کہ بڑی سہولت کے ساتھ ہوٹل میں قیام کر سکتا ہوں۔"

"آپ ہمیں میزبانی کی عزت بخشیں گے تو کیا آپ کے ایڈیٹر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔" حاجی صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

اس پر حاجی صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ آپ کے ایڈیٹر صاحب کو کوئی اعتراض نہیں۔۔ پھر آپکو کیا اعتراض ہے؟

مختار کو بھی مسکرانا پڑا۔

"کیا اعتراض ہے آپ کو؟"

"حاجی صاحب! اعتراض والا کوئی معاملہ نہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے میرے ایڈیٹر صاحب نے مجھے جو رقم دی ہے خرچ کرنے ہی کے لیے دی ہے۔"

"تو رپورٹر صاحب ۔ معاف کیجیے کیا اسم گرامی ہے آپ کا۔"

"مختار احمد۔"

"یہ رقم مجھے دے دیں اور سمجھ لیں خرچ ہو گئی۔"

حاجی صاحب نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ہوٹل کے مالک اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے بھرپور قہقہے سے فضا گونج اٹھی۔ مختار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس گتھی کو کس طرح سلجھائے۔ اس نے یہی الفاظ کہنے پر اکتفا کیا۔ "میں معذرت خواہ ہوں۔"

حاجی صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ مختار نے بڑی سنجیدگی سے اپنے رویے کا اظہار کیا ہے اس لیے انہوں نے اپنی بات پہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"آپ کی مرضی ۔ ہم تو ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔" اور وہ اسی لمحے ہوٹل کے مالک سے مخاطب ہوئے۔

"انوار صاحب! یہ ہمارے معزز مہمان ہیں ۔ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ فی الحال آپ کے ہوٹل ہی میں رہیں گے۔"

"بالکل تکلیف نہیں ہوگی ۔ ان کی خدمت کر کے ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔"

حاجی صاحب ہوٹل کے ہال سے نکل گئے تو مختار اوپر جانے لگا۔ چند منٹ بعد بیرا پانی لے آیا۔

"کھانا صاحب؟"

"ایک گھنٹے بعد۔"

مختار نے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی کرسی کمرے کی واحد کھڑکی کے قریب کھسکالی۔ چھوٹے بڑے مکان دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف درختوں کی قطاریں اُفق کے دھندلکوں میں پہنچ کر غائب ہوگئی تھیں۔ فضا میں کبھی دھوپ چمک اُٹھتی تھی اور کبھی بادلوں کی وجہ سے دھواں دھواں ہو جاتی تھی۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر دکان کے آگے ایک دو گاہک کھڑے تھے۔

وہ اُس وقت تک کھڑکی کے پاس کھڑا رہا جب تک بیرے نے آکر کھانے کی اطلاع نہ دی۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے حسبِ عادت سگریٹ سلگایا ہونٹوں سے لگایا اور چارپائی پر نیم دراز ہوگیا۔

اپنا پروگرام کہاں سے شروع کرے۔ اس کے بارے میں سوچتے ہی اُسے اُس خط کا خیال آگیا جو اُس کے ایڈیٹر نے اپنے کمرے میں بلاکر اُسے سنایا تھا۔ اُسے احساس ہونے لگا کہ یہ خط ضرور کسی نے لکھوا کر دفتر کو بھجوایا تھا۔ کیا یہ کارستانی خود حاجی صاحب کی تو نہیں تھی اور یہ بات سوچتے ہی حاجی صاحب اس کی نظروں کے سامنے آگئے۔

"سنا گیا ہے یہ شخص آدھے قصبے کا مالک ہے۔ دُور دُور تک بڑی نیک نامی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے باوجود مجھ جیسے ایک معمولی رپورٹر کی اتنی پذیرائی کی وجہ؟"

اس سوال نے اسے اُلجھن میں ڈال دیا اور وہ اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ یوں لگا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔

"یہ کون ہے۔ بیرا تو نہیں ہوسکتا۔ اُس نے پہلی مرتبہ بھی دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔ سگریٹ آدھے سے زیادہ جل چکا تھا۔ وہ اُس نے فرش پر پھینک کر اپنے بوٹ سے اُسے مَسل دیا اور دروازے کی طرف منہ کرکے بولا۔

"آئیے۔"

ایک لمبا تڑنگا، لمبی مونچھوں والا شخص فائیل بغل میں دبائے اندر آ گیا اور سر جھکا کر بڑے ادب احترام سے سلام کر کے کہنے لگا۔

"آپ فارغ ہیں؟"

"جی فرمایئے!"

"ذرا آپ کو گھمانا پھرانا تھا۔" اور وہ کرسی میں بیٹھ گیا۔

"میں گھومنے پھرنے ہی کے لیے تو آیا ہوں — آپ کی تعریف؟"

"میں سرکار کا منشی ہوں منصوبہ سازی میں اُن کو مشورے دیتا ہوں — سرکار نے ایک معمولی سے گاؤں کو ایک مثالی قصبہ بنا دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ —"

"منشی صاحب:" مختار نے اُسے فقرہ مکمل کرنے نہ دیا۔" آپ نے کیسے قدم رنجہ فرمایا؟"

"وہ — آپ یہاں پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"میرا کام یہ ہے کہ باہر سے جو بھی معزز مہمان آئیں اُن کی کچھ خدمت کروں۔ آنے والے مہمان کو یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا کیا منصوبے بنائے گئے ہیں۔ یہ دیکھئے۔" اور منشی نے فائیل بغل سے نکالی اور اس میں سے کاغذ نکالنے لگا "لڑکیوں کے لیے دو سکول، ایک مڈل تک، ایک ہائی، چار پرائمری سکول — میرا مطلب ہے چار اور پرائمری سکول — سرکار کئی مدرسے بنوا چکے ہیں۔ دو ہسپتال زیرِ تعمیر ہیں۔ کام جاری ہی رہتا ہے جی۔ یہ نقشہ دیکھئے۔" یہ کہتے ہوئے منشی ایک تہ کیا ہوا نقشہ کھولنے لگا۔

"یہ لڑکوں کا ہائی سکول ہے۔ اس کے ساتھ ایک وسیع گراؤنڈ ہوگی۔ لڑکیوں کے لیے پانچ سکول ہوں گے۔ ایک مہمان خانہ بھی تعمیر ہو رہا ہے۔ بچوں کے لئے ایک بہت خوبصورت پارک کام ہو رہا ہے۔ یہ منصوبوں کے نقشے ہیں۔ جو صاحب بھی تشریف لاتے ہیں میں ان کی خدمت میں ہر منصوبے کا ایک مکمل نقشہ پیش کر دیتا ہوں۔ اخباری حضرات مجھ سے ہی نقشے لے جاتے ہیں اور

اخباروں میں انہیں چھاپ دیتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں بھی پیش کرتا ہوں۔"

منشی نے پورا فائیل مختار کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ"

"آپ کے کام آئے گا۔"

"مہربانی کا شکریہ۔ یہ عمارتیں۔ لڑکیوں کے سکول، پرائمری سکول، ہسپتال۔ مکمل ہیں؟" مختار نے پوچھا۔

"بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ سرکار کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ یہ منصوبے جلد سے جلد مکمل ہو جائیں۔ کیوں کہ ان کے ذہن میں اور منصوبے بھی ہیں۔ نئے باغات بھی لگوانے کا ایک خاص منصوبہ زیر غور ہے۔"

"ٹھیک ٹھیک۔"

"تو اب آپ فارغ ہیں نا؟" منشی نے سوال کیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ایک کام تو کر لیا ہے میں نے۔" منشی نے فائیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس فائیل میں آپ کو تمام منصوبوں کی مکمل تفصیل مل جائے گی۔ دوسرا کام یہ ہے کہ آپ کو سیر کرائی جائے۔"

"دیکھیے منشی صاحب! آپ ایک ہی کام پر اکتفا کریں۔"

"جی میں سمجھا نہیں۔"

"آپ نے فائل دے دی ہے۔ کرم آپ کا اور حاجی صاحب کا۔ دوسرا کام مجھ پر ہی چھوڑ دیں۔"

منشی حیرت سے اُسے تکنے لگا۔

"مہمان سیر کر کے خوش ہوتے ہیں۔"

"میں تنہا سیر کرنے میں زیادہ خوش ہوتا ہوں۔ عادت ہے میری اور آپ جانتے ہیں، پرانی عادت سے چھٹکارا پانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔" مختار نے تکلفاً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر لی۔

منشی کے چہرے سے اس کی مایوسی مترشح تھی۔

مختار نے فائل ابھی تک ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اب اس نے اسے سرہانے کے اوپر رکھ دیا۔

"میرا خیال ہے آپ کچھ تھک چکے ہیں ـــ ابھی آرام کرنا چاہتے ہیں۔" منشی پوری طرح مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"لاری میں کافی دھچکے لگے تھے۔"

"شام کو کیا پروگرام ہے۔" منشی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو آرام کروں گا"

منشی نے جھک کر سلام کیا اور چلا گیا۔

منشی چلا گیا تو مختار نے فائل تکیے سے اٹھائی اور ایک ایک نقشے کی تہیں کھولنے لگا۔ ہر نقشے کے ساتھ اس کی پوری تفصیل درج تھی اور ایک الگ طویل مضمون میں حاجی صاحب کے وہ سارے کارنامے بھی درج تھے جو انہوں نے خرم آباد کو ملک کا ایک مثالی قصبہ بنانے کے سلسلے میں انجام دیئے تھے۔ اُسے یاد آ گیا کہ خرم آباد کے بارے میں اس نے سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر اخبار میں جو مضامین دیکھے تھے اُن میں یہ مضمون بھی شامل تھا۔

ابھی وہ نقشوں کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نیند آ گئی اور وہ فائل قریبی کرسی پر رکھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور سو گیا۔ وہ دِن کے وقت سونے کا عادی نہیں تھا مگر اُس روز تھکاوٹ کی وجہ سے دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ اُس وقت کھلی جب کمرے میں شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

غسل خانے میں جا کر اُس نے منہ دھویا اور جب لوٹا تو کمرہ روشن تھا۔

"جناب دو مرتبہ چائے لے کر آیا۔ آپ سو رہے تھے۔"

"لے آؤ۔"

بیرا چلا گیا اور جب تک وہ چائے لے کر لوٹے مختار کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ جگمگاتی ہوئی

فضا اُسے اچھی لگی اور اس کا جی بے اختیار چاہا کہ نیچے اُتر کر ذرا گھومے پھرے بیرا چائے لے آیا۔

"کھانا جناب؟"

"واپسی پر"

"آپ سرکار کے ہاں جا رہے ہیں؟"

"نہیں بھئی۔ یہیں گھوم کر واپس آجاؤں گا۔"

"سرکار، سرکار۔ ہر بات میں سرکار۔ معلوم ہوتا ہے سرکار کی ذات ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو کر رہ گئی ہے۔ مختار نے چائے پیتے ہوئے سوچا اور خالی پیالی میز پر رکھ کر نیچے اُترا۔

"کہیں چلنے گا حجور۔" مختار نے اپنی بائیں جانب دیکھا۔ ایک تانگہ کھڑا تھا اور یہ سوال کوچوان نے کیا تھا۔

"ہاں۔"

کوچوان نے گھوڑے کی پشت پر تھپکی دی اور گھوڑا چلنے لگا۔ یکایک مختار کے ذہن میں ایک خیال آگیا۔

"تانگے والے!"

تانگہ رک گیا۔

"جی حجور۔"

"صبح یہاں آجاؤ گے۔ ہوٹل پر؟"

"آجاؤں گا۔ کتنے بجے حجور؟" کوچوان نے پوچھا۔

"آٹھ، ساڑھے آٹھ۔"

کوچوان نے "بہتر" کہا۔ اور اس کا گھوڑا ہلکی چال سے چلنے لگا۔

ہوٹل سے نکلتے وقت مختار اپنا کیمرہ لے آیا تھا جو اُس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔

اُس نے بارونق دکانوں کے فوٹو لئے اور نیا فوٹو لینے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہارن کی آواز اُس

کے کان میں آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی گاڑی تھی جو لاری اڈے پر اُسے لینے کے لیے پہنچی تھی۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا۔

"میں ہوٹل پہنچا تھا۔ پتا چلا آپ گھومنے پھرنے نکلے ہیں۔ بیٹھئے۔"

"مجھے پیدل چلنے میں لطف آ رہا ہے۔"

"سرکار نے کہا ہے آپ کو سیر کرائی جائے۔"

"اس طرح سیر کرنے میں زیادہ مزا ہے۔"

ڈرائیور سر کھجانے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ایک دو منٹ وہاں کھڑا رہا پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

وہ چلتے چلتے قصبے کے اُس حصے میں پہنچ گیا تھا جو نسبتاً کم رونق تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے مکان نظر آ رہے تھے۔ ان میں کچھ کچے مکان بھی تھے۔

"یہاں قصبے کا غریب طبقہ رہتا ہے۔ کل یہیں آؤں گا۔" اُس نے دل میں ارادہ کر لیا اور واپس جانے لگا۔

صبح ناشتا کرنے کے بعد اُس نے کلائی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بجے چکے تھے۔ پروگرام تانگے والے سے طے ہو چکا تھا اس لئے وہ اپنا ساز و سامان لے کر نیچے اُترا، چند منٹ ہال کی ایک کرسی پر بیٹھ کر تانگے کا انتظار کرتا رہا۔

"جناب چائے لاؤں؟" بیرے نے پوچھا۔

"ناشتا تو کر چکا ہوں۔ انتظار ہے۔"

"کس کا جناب۔"

"تانگہ آئے گا۔"

"تانگہ جناب؟" بیرے نے حیرت سے سوال کیا، اس لمحے کسی نے پیچھے ہوئے سے میز پر مار کر بیرے کو اپنی طرف بلا لیا۔ عمّار باہر آ گیا۔ تانگہ پہنچ چکا تھا۔

"معاف کریں حضور، ذرا دیر ہو گئی۔" تانگے سے اُتر کر کوچوان نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

وہ تانگے میں بیٹھ گیا۔

"حضور فرمایئے۔"

"تمہارا نام کیا ہے میاں کوچوان؟"

"میرا نام چراغ دین ہے۔ بیس برس سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔"

"یہاں سے نکلو پہلے۔ پھر بتاؤں گا کہاں جانا ہے۔"

تانگہ بازار میں سے گزرنے لگا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک دوراہے پر آ گیا۔

"کدھر جانا ہے حضور؟"

"چراغ دین تم بیس برس سے یہاں ہو۔ تمہیں ہر چیز کا علم ہو گا۔ وہاں چلو جہاں لڑکوں لڑکیوں کے سکولوں اور ہسپتالوں کی عمارتیں بنائی جا رہی ہیں۔ سب عمارتوں پر جانا ہے۔"

چراغ دین نے مڑ کر کچھ اس انداز سے مختار کو دیکھا جیسے وہ گھبرا گیا ہو۔

"یہ میں نہیں جانتا حضور۔"

مختار کو چراغ دین کی طرف سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ بولا "چراغ میاں! تم کہتے ہو بیس برس سے یہاں ہو اور تمہیں ان عمارتوں کی خبر نہیں ہے۔ کیسے کوچوان ہو تم؟"

"کہیں اور؟" چراغ دین کا سر جھکا ہوا تھا۔

"اور کہاں جانا ہے مجھے یہ ساری عمارتیں۔ یہ کام بہت ضروری ہے۔ میں آیا کس مقصد کے لیے ہوں۔ اتار دو مجھے۔"

مختار نے پائیدان پر دایاں پاؤں رکھ دیا۔

"ناراض نہ ہوں حضور۔"

"تم بات ہی ایسی کرتے ہو۔"

مختار کا پاؤں پائیدان ہی پر تھا مگر وہ تانگے سے نیچے اترا نہیں تھا۔

"حضور۔"

چراغ دین کے منہ سے یہ لفظ سن کر اور اس کے چہرے کی کیفیات پر نظر ڈال کر مختار نے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مختار نے اپنا پاؤں کھینچ لیا۔

"چراغ دین مجھے سچ سچ بتاؤ معاملہ کیا ہے۔"

"حضور میں کبھی اُدھر گیا نہیں ہوں۔"

"اس لئے تو میں کہتا ہوں مجھے اتار دو۔ پوچھ گچھ کر کے پیدل چلا جاؤں گا۔"

چراغ دین سوچ میں پڑ گیا۔

"بیٹھے رہیے۔"

گھوڑے کی رفتار خاصی سست تھی۔ کوچوان بھی خاموش تھا اور اس کی سواری بھی۔

ایک جگہ جا کر چراغ دین نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ آہستہ آہستہ تانگے کی حرکت بند ہو گئی۔ سامنے ایک وسیع میدان میں، جہاں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا، اینٹوں کے کچھ ڈھیر پڑے تھے۔ اور چند دیواریں بھی نظر آ رہی تھیں۔

"یہ مجھے کہاں لے آئے ہو تم چراغ دین۔" مختار نے ذرا غصے سے کہا۔

"حضور یہاں عمارتیں بنیں گی۔"

"سکولوں کی اور ہسپتالوں کی؟"

"حضور۔"

"مگر یہاں تو ایک عمارت بھی مکمل نہیں ہے۔"

چراغ دین خاموش رہا۔

"تم مجھے غلط جگہ پر لے آئے ہو اس فائل میں جو نقشے ہیں۔ مجھے ان نقشوں کی عمارتیں دیکھنا ہیں۔"

"وہ میں نہیں جانتا۔"

مختار کو غصہ آیا مگر نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ چراغ دین اصل معاملہ چھپا رہا ہے۔ بہر حال اس نے جو کچھ دکھائی دے رہا تھا اسے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔

"اچھا مجھے اس آبادی میں لے چلو جہاں غریب لوگ رہتے ہیں۔"

"کیا کریں گے وہاں جا کر؟"

"تمہیں اس سے کیا مطلب ہے، تمہارا تانگہ کرایے پر لیا ہے۔ مجھ سے پورا پورا کرایہ وصول کرو اور جہاں جہاں کہتا ہوں لے چلو۔ سنا تم نے؟"

"تانگہ چلنے لگا اور آدھ گھنٹے کے بعد ایک مقام پر پہنچ کر تانگہ رک گیا۔

وہاں ہر طرف بہت معمولی، خستہ حال اور کچے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ جہاں تہاں مٹی اور گندگی کے ڈھیر پڑے تھے ننگے بدن بچے گرد و غبار سے اٹے راستوں پر کھیل رہے تھے۔

"یہ میرا مکان ہے۔" چراغ دین نے ایک چھوٹے سے مکان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مختار دور دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مکان آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ یہ لگتا تھا یہ ایک پسماندہ گاؤں ہے جہاں قصبے کی بیشتر آبادی رہتی ہے۔

افسردہ پژمردہ چہرے، گندے لباس، جھکی جھکی کمریں جو محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھیں۔ مختار ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کا ذہن بیک وقت کئی اذیت ناک سوالوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

"چراغ دین جس اخبار کی طرف سے آیا ہوں وہ سچی باتیں لکھتا ہے۔ اور میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ سچی باتیں لکھ کر لے جاؤں۔ تم جانتے ہو چراغ دین۔ لوگوں سے جھوٹ بولا جائے تو اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اللہ میاں ناراض ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تم خود جانتے ہو نا۔"

یہ لفظ سنتے ہی چراغ دین کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ ایک شدید اندرونی جذبے سے اس کا ماتھا تمتما اٹھا۔

"کیا پوچھتے ہیں حجور؟" نر فشا نے پوچھا تھا۔

"صرف یہ کہ مجھے سچی باتیں بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"یہ گاؤں کن لوگوں کا ہے؟"

"یہ خرم آباد کے لوگ ہیں۔ پہلے ان کی زمینیں سرکار نے اونے پونے داموں خرید لی تھیں اب یہ اُن کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں، چھوٹی چھوٹی دکانداریاں کرتے ہیں۔"

چراغ دین چپ ہو گیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

مختار ایک طرف چلنے لگا۔ ساتھ چراغ دین بھی تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ مختار نے بے شمار فوٹو لئے۔

دونوں تھک چکے تھے۔

"چراغ دین اب تمہارے گھر چلتے ہیں!"

"میرے گھر؟" چراغ دین سخت متعجب تھا۔

"ہاں تمہارے گھر میں، تمہارے بچوں سے مِلنا چاہتا ہوں۔"

چراغ دین نے ایک لمبی آہ بھری۔ "حجور میرا کوئی بیوی بچہ نہیں ہے۔"

ہوٹل پر واپس پہنچ کر مختار نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے۔

"یہ لو چراغ دین۔"

"کیوں حجور؟"

"بھئی کرایہ۔"

"نہیں حجور، آپ سرکار کے مہمان نہیں بنے تھے۔ میرے مہمان تھے، میں اپنے مہمان سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔"

مختار کو سارے نوٹ واپس جیب میں ڈالنے پڑے۔

"مجھے صبح سویرے لاریوں کے اڈے پر جانا ہے۔" مختار نے ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"پہلی لاری اذانوں کے وقت جاتی ہے۔ حاجر ہو جاؤں گا حجور۔"

مختار اپنے کمرے میں پہنچا اور شام تک میز کے اوپر کاغذوں پر جھکا رہا۔ اس دوران اس کا قلم رواں دواں رہا۔

معمول کے مطابق بدھ کی صبح کو 'صداقت شعار' کا تازہ شمارہ شائع ہوا تو اس کے پہلے صفحے پر مختار احمد کی سیاہ حاشیوں کے درمیان تصویر چھپی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"ہم بڑے دکھ کے ساتھ یہ انتہائی افسوسناک خبر اپنے قارئین کرام تک پہنچا رہے ہیں کہ مختار احمد خرم آباد سے واپسی پر مار دیئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ اس تانگے کا کوچوان چراغ دین بھی خون میں لت پت پایا گیا تھا جس کے تانگے میں وہ بیٹھ کر لاری اڈے کی طرف جا رہے تھے۔

مرحوم مختار احمد بے حد فرض شناس، محنتی، بیباک، جرات مند رپورٹر تھے۔ گزشتہ سات سال سے وہ اخبار کی رپورٹنگ کر رہے تھے۔ اور انہوں نے ہمیشہ سچی رپورٹنگ کی تھی۔

تفتیش بتاتی ہے کہ خرم آباد کے کسی قریبی گاؤں کے جرائم پیشہ گروہ نے یہ ظالمانہ اور سفاکانہ کاروائی کی ہے۔ مرحوم مختار کا سارا سامان بھی یہ گروہ لے گیا ہے۔"

اخبار کے اندرونی صفحے پر شہر کے بعض مشاہیر کے تعزیتی بیانات درج تھے۔ ان میں خرم آباد کی مشہور ترین شخصیت حاجی رحیم علی کا بیان نمایاں طور پر شامل تھا۔

حاجی صاحب نے مختار احمد کی موت کو ایک قومی المیہ سے تعبیر کیا تھا اور اس پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔

سزا

رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب کھانا کھانے، کوئی کتاب پڑھنے اور کچھ دیر آنکھیں بند کرکے آرام کرسی میں نیم دراز رہنے کے بعد سیٹھ ابراہیم اپنے پلنگ پر لیٹ جاتا تھا۔ عام طور پر اسے جلد نیند نہیں آتی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ صبح پانچ، سوا پانچ بجے اس کا پرانا نوکر غلام محمد سیٹھ کی خواب گاہ کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر ناشتہ تیار کرنے کی خاطر باورچی خانے میں چلا جاتا تھا۔ دستک سننے سے پہلے ہی وہ جاگ کر کمرے میں ٹہلتا تھا یا خود کو آرام کرسی میں گرا دیتا تھا۔

وہ رات ایسی ہی ایک رات تھی جیسی وہ ہزاروں کی تعداد میں گزار چکا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر پلنگ کی طرف جا رہا تھا، کمرے کا بلب بجھا کر جب اس نے ٹیبل لیمپ کا زیرو بلب روشن کیا تو نہ جانے اسے یہ احساس کیسے ہو گیا کہ کمرے کے باہر کوئی شخص آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اس سے پیشتر اس نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پلنگ پر لیٹ جائے مگر پلنگ کے پاس جا کر رک گیا تھا۔

فضا میں سناٹا تھا۔ دیوار کے کلاک کی مدھم ٹک ٹک جاری تھی۔ کہیں دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز وقفے وقفے سے آ جاتی تھی۔

پلنگ پر بیٹھتے ہی وہ کسی مبہم احساس کے زیرِ اثر اُٹھ بیٹھا۔

"کوئی ہے یہاں پر۔" اُسے احساس ہو رہا تھا۔

"کون آسکتا ہے یہاں !" مگر یہ جواب اُسے مطمئن نہیں کر سکا تھا۔

سیٹھ کھڑکی کے سامنے چلا گیا۔ اُس کا ایک پٹ کھولا۔ وہ اپنی آنکھوں کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ اندھیرے میں کوئی سایہ حرکت کر رہا تھا۔

اُس نے کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی کھول دیا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا۔

وہ کھڑکی کے سامنے چند لمحے کھڑا رہا۔ سایہ غائب ہو چکا تھا۔

"محض میرا وہم تھا۔" اور دل کو یہ یقین دلا کر وہ کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ کی طرف جانے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"غلام محمد ؟" اُس نے سمجھا نوکر کسی خاص ضرورت سے آیا ہے۔

کوئی جواب نہ ملا۔ دستک ہوتی رہی۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"کون ؟"

" دروازہ کھولئے ۔"

یہ کون تھا جو آدھی رات کو نہ جانے کس طرح اُس کے بنگلے میں داخل ہو کر اس کی خواب گاہ کے باہر دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

" ہو کون ؟

وہی جواب تھا۔" دروازہ کھولئے۔"

ایک جذبۂ بے اختیار سے مجبور ہو کر اُس نے دروازہ کھول دیا۔ اُس کے سامنے کوئی کھڑا تھا۔

" کون ہو تم ۔ کیا چاہتے ہو؟"

" آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"رات کے وقت؟"

"جی ہاں۔ رات ہی کے وقت۔"

کمرے میں بڑی مدھم روشنی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑے ہوئے شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میں پوچھتا ہوں۔ ہو کون تم؟"

سیٹھ نے اُس کی ایک بانہہ اپنی گرفت میں لے لی تھی۔

"میں چور نہیں ہوں سیٹھ۔ میں کچھ لینے نہیں آیا۔ روشنی کیجیے۔ شاید۔ آپ۔"

کمرے میں روشنی ہو گئی۔ آنے والے نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر کمرے کا لیمپ جلا دیا تھا، وہ کمرے کے سوئچ بورڈ سے واقف معلوم ہوتا تھا۔

"تم۔؟"

"پہچان لیا سیٹھ ابراہیم؟"

"کیا کہنے آئے ہو؟"

آنے والا ایک دو لمحوں کے لیے خاموش رہ کر بولا "یہاں کھڑے کھڑے نہیں کہہ سکتا۔"

"کھڑے کھڑے نہیں کہہ سکتے۔ مگر مجھے بتاؤ تم کیا کہنے کے لئے آئے ہو۔ کیا مقصد ہے تمہارا۔ یہاں آنے کا تمہیں حق ہی کیا ہے؟" سیٹھ کا لب ولہجہ درشت تھا اور اُس نے ایک ہی سانس میں تینوں سوال کر دیئے تھے۔

"کوئی حق نہیں۔"

"پھر؟"

"اگر مجھے کچھ کہنا نہ ہوتا تو ہرگز نہ آتا۔ مدت ہوئی میں اِس گھر کے لیے مر چکا ہوں۔ اس گھر سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

سیٹھ خاموش رہا اور وہ کہنے لگا۔

"آپ ایک لمحہ کے لیے بھی میرا یہاں آنا برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ میں جانتا ہوں مگر یہ دیواریں

جو میرے ارد گرد کھڑی ہیں، شاید مجھے پہچانتی ہیں - یہ کمرہ جس کے دروازے پر آپ نے مجھے روک رکھا ہے - شاید مجھے اندر جانے کی اجازت دے دے گا کیوں کہ یہ مجھے پہچانتا ہے۔"

سیٹھ کمرے کے اندر جانے لگا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"آؤ۔"

وہ اندر چلا گیا۔

"کہو اب - ایک بات سن لو میں اپنی زندگی میں کبھی جذباتی نہیں رہا۔"

"سیٹھ صاحب!"

سیٹھ نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔

"کیا یہ بات وہ شخص نہیں جانتا جسے کبھی آپ کے ۔"

سیٹھ نے غصے سے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں لہرایا۔

"فی الفور کہو۔"

"میرے سینے میں ایک طوفان برپا ہے - مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔"

"کچھ کہنا بھی ہے یا نہیں؟" سیٹھ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تم میرا وقت ضائع کرنے کے لیے آئے ہو۔ اور تم جانتے ہو کہ میں یہاں اپنے گھر میں تمھیں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے؟"

دونوں پھر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ۔

"ابا جی ۔"

یہ لفظ سنتے ہی سیٹھ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی برسنے لگیں۔

"شرم کرو۔ بے حیا بے غیرت۔ اس شخص کو ابا جی کہہ رہے ہو جس سے تمہارے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ جسے عین نوجوانی کے عالم میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جس کے ساتھ اب تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ صاف صاف کہو، کیا کرنے آئے ہو۔ آوارہ گرد، منحوس، اوباش ۔"

سیٹھ نے غیر شعوری طور پر اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا۔

"میں ان سب الفاظ کا مستحق ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ صوفے کے کنارے بیٹھ گیا۔ سیٹھ اسے گھورتا رہا۔ پھر اُس کے سامنے کرسی میں بیٹھنے کی بجائے اس کے بازو کے قریب رک گیا۔

"آج سے سترہ برس پہلے۔ اس گھر میں آپ کا پہلا اور آخری بچہ پیدا ہوا تھا۔ جس کے دُنیا میں آتے ہی آپ کی اور امی کی اداس دنیا میں رونق آ گئی تھی۔ آپ کو یاد ہے نا۔"

سیٹھ نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

"یہ بچہ آپ کی آنکھوں کا نُور اور اپنی امی کے دل کا سرور تھا۔ دونوں اسے زندگی کی سب سے بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ اس نعمت کو آپ اور امی آصف کہہ کر پکارتے تھے۔ سترہ برس بعد بھی آصف آپ کے سامنے کھڑا ہے اور آج اس کی ایک جھلک بھی آپ دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"بس یہی کہنے آئے تھے؟"

"نہیں۔"

"تو کہتے کیوں نہیں ہو؟"

"وہ کہتا ہوں۔ میں دُور اپنے ماضی کے اُس زمانے میں جاتا ہوں۔ جب مجھے اپنے باپ اور ماں کی طرف سے بھرپور پیار ملتا تھا۔ آپ طبعاً سخت گیر تھے۔ لوگ آپ سے ڈرتے تھے مگر جب گھر آکر مجھے پیار سے گود میں اٹھا لیتے تھے تو چوم چوم کر میرے گال سُرخ کر دیتے تھے۔ میں جو چیز بھی مانگتا تھا، آپ مجھے فوراً مہیا کر دیتے تھے۔ آپ ایک مشفق باپ تھے۔"

سیٹھ کرسی کے بازو سے ہٹ کر باقاعدہ کرسی میں بیٹھ گیا تھا۔

"ان باتوں کے کہنے کی ضرورت؟"

"ضرورت ہے ابا جی! اس زمانے سے میری خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔"

"میری یادیں وابستہ نہیں۔"

وہ ذرا رکا اور پھر کہنے لگا۔

"میں خوشی بھری زندگی گزار رہا تھا۔ میرے چاروں طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ گھر کے اندر، گھر کے باہر۔ پھر ایک روز میرے ایک سکول کے دوست رفیق نے رازداری سے کہا۔

"آصف! خان صاحب کا جو نوکر ہے نا۔ اُس نے کہا ہے آصف کے ابا جی شراب پیتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شراب کیا چیز ہوتی ہے۔ مگر اُس کے فقرے سے یہ ضرور محسوس ہو گیا کہ شراب کوئی اچھی شے نہیں ہوتی۔ گھر آ کر جب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تو میں نے رفیق نے جو کچھ کہا تھا، آپ سے کہہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ الفاظ سنتے ہی آپ کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ اور دوسرے روز رفیق ہی نے بتایا کہ تمہارے ابا جان نے خان صاحب کے نوکر کو نوکری سے جواب دلوا دیا ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میرے معصوم ذہن میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی۔ شراب کیا ہوتی ہے۔ آپ نے خان صاحب کے نوکر کو کیوں نکلوا دیا۔ یہ سوال بار بار میرے دماغ میں آتے تھے اور میں بے قرار سا ہو جاتا تھا۔"

سیٹھ نے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے ہوئے تھے اور اُس کی پیشانی شکن آلود تھی۔

" امی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سکول کا کام کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ کہتی تھیں تم صوفوں پر سیاہی کے دھبے لگا دیتے ہو۔ آپ نے کہا تھا۔ آصف بیٹا! میرے کمرے میں بیٹھا کرو اور میں ہر روز تو نہیں کبھی کبھی آپ کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔"

وہ ذرا رک کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"آپ نے اپنا کمرہ بہت سجا رکھا تھا۔ ایک الماری کے اندر رنگا رنگ بوتلیں نظر آیا کرتی تھیں۔ ان بوتلوں سے شعاعیں سی پھوٹتی رہتی تھیں۔ میں کام کرتے کرتے یونہی ان بوتلوں کو دیکھ لیا کرتا تھا اور ایک بار تو اس الماری کے سامنے کئی منٹ کھڑا بھی رہا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ امی کمرے میں آ چکی ہیں۔ انہوں نے مجھے اِس حالت میں دیکھا تو پوچھا۔

"کیوں کھڑے ہو یہاں؟"

میں شرمندہ سا ہوگیا کیونکہ امی کے لہجے میں معمول کے خلاف قدرے درشتی تھی۔

ایک مرتبہ اور امی نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگیں۔

"آئندہ یہاں نہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا کرو۔"

"امی یہ کیا ہیں؟" میں نے امی سے بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"امی کچھ سوچنے لگیں۔

"بوتلیں ہیں شربتوں کی۔" اور یہ کہہ کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر لے گئیں۔

" ویسے میں ٹھیک تھا۔ اپنے سارے کام کرتا تھا لیکن جو کشش کشش سی میرے ذہن میں ابھر آئی تھی وہ ختم نہ ہوسکی۔ میں نے نہ جانے کیسے یہ محسوس کرلیا تھا کہ امی نے جب یہ کہا تھا کہ 'بوتلیں ہیں شربتوں کی' تو ان کے چہرے پر ایک سیاہ سی لکیر پھیل گئی تھی۔ یہ لکیر ان کے اضطراب کی علامت تھی۔

"میں نے آپ کے کمرے میں جانا نہ چھوڑا اور وہ منحوس لمحے جو میرا تعاقب کر رہے تھے — ایک روز آ گئے۔ امی گھر پر نہیں تھیں۔ نوکر وغیرہ باورچی خانے میں تھے۔ میں سکول سے آیا تو ایک مبہم سی خواہش مجھے آپ کے کمرے میں لے گئی۔ ان لمحوں میں میں نے دیکھا کہ دو تین بوتلیں اور گلاس میز کے اوپر پڑے ہیں۔ میرے سینے میں گھٹن سی ہونے لگے۔ میں کمرے سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دوڑ کر دروازے پر پہنچا۔ اور پھر، پھر۔"

وہ، لگتا تھا ایک شدید ہیجانی کیفیت سے گزر رہا ہے۔

میں قے کرنے لگا۔

اس روز امی کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے زیادہ گہرے ہوگئے تھے۔ انہوں نے میرے منہ پر بے تحاشا تھپڑ مارے اور خود زار و قطار رونے لگیں۔

اس رات آپ اور امی کے درمیان سخت لڑائی ہوئی۔ امی کی گھٹی گھٹی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شکست کھا گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں: ناصر! شادی کے بعد میں نے بڑی کوشش کی کہ الماری کے اندر جو زہر بھرا ہے اُسے دور کر دوں۔ میں بار بار بوتلوں اور تمہارے درمیان کھڑی ہوگئی مگر ہر بار

تم نے مجھے دھکا دے کر ہٹا دیا۔ اب میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ انھیں الماری میں نہ رکھو کہیں اور رکھ دو۔ کسی جگہ چھپا دو۔ کسی پوشیدہ جگہ پر۔"

"کیوں؟" آپ نے گرجتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دیکھو ناصر! اس گھر میں ایک معصوم بچہ بھی پرورش پا رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ بچہ صحت مند ماحول میں نشوونما پائے۔ اس کا کردار صاف ستھرا ہو۔ کیا آپ یہ نہیں چاہتے؟"

"اس کا کردار صاف ستھرا کیوں نہیں ہوگا؟" آپ گرجے۔

"ان بوتلوں کی گھر میں موجودگی۔"

"کیا سمجھتی ہو تم۔ اگر اس نے بوتل کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ جانتی نہیں ہو میں کس طبیعت کا آدمی ہوں؟"

"پھر بھی خدا کے لیے انھیں کہیں اور چھپا دو۔"

"ہرگز نہیں۔"

امی نے رو رو کر اصرار کیا مگر آپ تو اُن بوتلوں کو اپنی الماری میں سجا کر اپنی امارت اپنی انا کا اظہار چاہتے تھے۔ اپنے دوستوں کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ امی رو رو کر اصرار کرتی رہیں۔ آپ نے ان کی ہر التجا ٹھکرا دی۔

اس کے بعد امی نے مجھے سختی کے ساتھ آپ کے کمرے میں جانے سے روک دیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ دُور سے کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ کلاک کی ٹک ٹک برابر جاری تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

"امی ہر وقت گھر میں نہیں رہتی تھیں۔ باہر جاتی تھیں تو آپ کے کمرے کو مقفل کر جاتی تھیں۔ ایک روز وہ باہر تھیں۔ آپ اپنے دوستوں کے ساتھ آئے اور آپ نے اپنے کمرے کا تالا توڑ دیا۔

اُس روز آپ کے دوستوں نے بڑا ہنگامہ کیا۔ میں نے چھپ کر انھیں ناچتے ہوئے، گاتے ہوئے، زور زور سے شور مچاتے ہوئے دیکھا۔ آپ بھی ان میں شامل تھے۔ آپ کے ایک دوست کی

نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ مجھے گردن سے پکڑ کر اندر لے آیا۔

سب کے سب اپنے حواس کھو چکے تھے اور اُس کی حالت تو بہت ہی خراب تھی جو مجھے پکڑ کر اندر لے آیا تھا۔ اُس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پی، بیٹا پی۔ باپ پیتا ہے۔ بیٹا کیوں محروم رہے؟ آپ دیکھتے رہے۔ آپ کی اپنی حالت غیر تھی۔

دوسرے روز آپ نے میری سخت پٹائی کی مجھے لہولہان کر دیا اس جرم پر کہ میں کمرے میں کیوں چلا گیا تھا۔

رات امی روتی جاتی تھیں اور میری مرہم پٹی کرتی جاتی تھیں۔ میرے دل میں آپ کے خلاف انتقام کی چنگاری سلگ اٹھی، اور میں صبح ہی صبح گھر سے نکل گیا۔"

چار گھورتی ہوئی نظریں مقابل کے چہروں پر جمی تھیں۔

"میں نے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ یہ سب کچھ بتانا ضروری بھی تھا۔ لیکن جو بتانے آیا تھا وہ ابھی تک نہیں بتا سکا۔" وہ بولا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"بتا دو۔" باپ کا لہجہ پہلا سا درشت نہیں تھا۔

"گھر سے نکلتے وقت سوائے انتقام کے میرے ذہن میں کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں سٹیشن پہنچ گیا۔ غیر ارادی طور پر، وہاں میری ملاقات ایک ایسے لڑکے سے ہو گئی جو میری ہی طرح گھر سے نکل آیا تھا۔ ہم دونوں پنڈی چلے گئے اور ایک موٹر مکینک کی ورکشاپ میں ملازم ہو گئے۔ اسے شراب کی لت پڑ چکی تھی۔ وہ مجھے اپنی راہ پر لے گیا۔ میں گرتا چلا گیا۔ اپنے گھر سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ کبھی کبھی رات کے بے قرار لمحوں میں امی یاد آ جاتی تھیں اور میں سوچ لیتا تھا۔ گھر واپس چلا جاؤں گا۔ مگر رک جاتا تھا اور ایک دن جب یہ خبر سُنی کہ وہ دنیا سے چلی گئی ہیں تو میں ایک ایسا خزاں زدہ پتہ بن گیا جسے ہوا کا جھونکا اِدھر اُدھر اڑائے پھرتا ہے جس کا اپنا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ جو جھونکوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔"

دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"میں زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ موت کی آرزو میرے اندر تیزی سے پرورش پا رہی تھی کہ یکایک جیون کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک کرن چمک اٹھی۔ یہ کرن فرخندہ تھی۔ ورکشاپ کے مالک کی بیٹی۔ میں روز مالک کے گھر سے کھانا لینے جاتا تھا تو اُسے ضرور دیکھتا تھا۔ اس سے ہم دونوں میں پیار بڑھتا گیا۔ ہم میں شادی کے عہد و پیماں ہو چکے تھے کہ۔"

بولنے والے کا چہرہ سخت کرخت ہو کر بھیانک بن گیا تھا۔

"اُس کے باپ کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں تھا کہ اس کی بیٹی ایک معمولی ملازم سے بیاہ کرے۔ اُس نے میری درخواست سنتے ہی بے عزت کر کے مجھے اپنی ورکشاپ سے نکال دیا۔ میری زندگی کی آخری اُمید بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد میرے لیے زندہ رہنے کا کوئی آسرا، کوئی سہارا نہ رہا۔ سن رہے ہو سیٹھ۔"

اُس کی آواز فرطِ غصہ سے ایک للکار بن گئی تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ تم سے کچھ کہنے کے لیے آیا ہوں۔ میں یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے۔ لیکن اپنی زندگی کی آخری رات گزارنے سے پہلے تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم ایک قاتل ہو۔"

سیٹھ جیسے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"سیٹھ! تم ایک قاتل ہو۔ اپنے بیٹے کے قاتل ہو۔ میرا قتل تمہارے ہاتھوں ہُوا ہے۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو سیٹھ تم نے اپنی ضد سے ایک معصوم بچے کو اُس راستے پر نہیں لگایا تھا جس پر وہ چل نکلا تھا؟ میری بربادی کی ساری وجہ تم نہیں ہو تو کون ہے، بتاؤ۔ مگر کیا بتاؤ گے تم۔ اس رات کے بعد میں نہیں ہوں گا۔ لیکن تم ہو گے۔ اپنے اِس احساس کو سینے میں لے کر کہ تم قاتل ہو۔ سوتے میں، جاگتے میں یہ احساس تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔

سیٹھ اُسے دیکھتا رہا۔

"آصف!"

وہ دروازے کی دہلیز پار کرنے ہی والا تھا۔

"رُک جاؤ آصف۔"

"کیوں؟"

"یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے۔ مگر ابھی یہ رات باقی ہے۔"

"مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

"مجھے تو کہنا ہے۔"

سیٹھ دروازے کی طرف بڑھا۔

باپ بیٹا ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے تھے۔

"میں تمھیں جانے سے نہیں روکوں گا۔"

"کیا تم روک سکتے ہو مجھے؟"

"نہیں ۔روک نہیں سکتا۔ چند لفظ تو کہہ سکتا ہوں۔ سنتے جاؤ۔"

بیٹے نے گھور کر اُسے دیکھا۔

"تم چلے گئے ۔مجھے دکھ ہوا۔ لیکن میرے اندر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی ۔تمہارے جانے کے سات برس بعد تمہاری ماں کینسر کے مرض میں مبتلا رہ کر مجھے چھوڑ گئی ۔اُس کے جانے کے بعد میرے اندر ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ میرا کچھ بھی سلامت نہ رہا۔ معلوم ہونے لگا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔"

باپ کا ہاتھ غیر ارادی طور پر بیٹے کے کندھے سے جا لگا تھا۔

"بیٹے!"

بیٹے نے سر اُٹھایا۔

"آصف بیٹے۔"

بیٹا خاموش تھا۔

"میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ایک انسان، دوسرے انسان کو ہزار اذیت دے۔ مگر یہ اذیت اُس اذیت سے زیادہ نہیں ہوتی جو انسان خود کو دیتا ہے۔ میرا پچھتاوا میری سب سے بڑی اذیت ہے جو میں خود کو دیتا رہا ہوں۔"

صبح آہستہ آہستہ طلوع ہو رہی تھی۔ روشندان کا ایک کونا چمکنے لگا تھا۔

دونوں کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

باپ نے بیٹے کو دیکھا اور دو تین لمحے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا دایاں ہاتھ اُٹھا اور بیٹے کے کندھے سے جا لگا۔

"آصف بیٹے!"

بیٹے نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں ایک پچھتاوے کا مارا باپ ہوں۔ تم ایک مایوس بیٹے ہو۔ آؤ اس رات کو یہیں چھوڑ دیں۔ شاید باہر کہیں نہ کہیں روشنی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ اس روشنی کو ڈھونڈتے ہیں۔ بیٹے! تمہاری خوشی میرے پچھتاوے کا دکھ کم کر دے گی۔"

باپ نے بیٹے کے کندھے سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اب بیٹے کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور آدھ گھنٹے بعد دونوں ریلوے سٹیشن میں داخل ہو چکے تھے۔

پورے تیس۳۰ برس یونیورسٹی سے وابستہ رہنے کے بعد پروفیسر کرمانی اپنی ساری معلمانہ ذمےداریوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے معاملات میں حسبِ خواہش جو چاہے رویہ اختیار کر سکتا تھا۔ اور اُس نے یورپ کے اُس سفر کا منصوبہ بنا لیا تھا جو ایک خواب کی طرح سالہا سال سے اُس کے ذہن میں چلا آرہا تھا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ اور دنیا کی سیر و سیاحت! وہ اکثر تنہائی کی گھڑیوں میں یہ بات سوچتا رہتا تھا اور اس سوچ کے ساتھ ہی اس کے رگ و پے میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی اور اس روز ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد آخری چالیس منٹ اپنے اُس گھر میں گزار رہا تھا جو اس کے باپ کی طرف سے اسے ورثے میں ملا تھا۔ "نہ معلوم اَب کتنی مدت بعد میں واپس اس چار دیواری میں آؤں گا؟" اُس نے خود سے کہا تھا۔

اس کے تمام امور طے پا چکے تھے۔ کوئی معاملہ ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں اُسے کسی قسم کا تردد ہو۔ اُسے کسی قسم کی پریشانی، کوئی فکرمندی نہیں تھی۔

اپنی پُرانی ملازمہ سے اُس نے کہہ دیا تھا "ٹیکسی آئے تو مجھے فوراً اطلاع کر دینا"، اور یہ الفاظ کہہ کر وہ سب سے پہلے اُس کمرے میں گیا جہاں اُس نے زندگی کا پہلا سانس لیا تھا۔ یہ کمرہ مدت سے سٹور بن چکا تھا۔ اِدھر اُدھر پُرانی اور تقریباً ناقابلِ استعمال چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں اُس نے کئی بار شاگردوں کو بُلا کر لیکچر دیئے تھے، اُسے اپنے شاگردوں سے محبت تھی اور اس کی ہمیشہ یہ آرزو رہی تھی کہ اِن نوجوانوں کا کیریئر سنوارنے میں ممکن حد تک حصہ لے

چنانچہ چھٹی کے روز وہ انھیں اپنے گھر میں بلا لیتا تھا۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ اس کمرے میں گیا جو کسی زمانے میں اس کے لیے لائبریری کا کام دیتا تھا۔ پچھلے چند سال میں اُسے ایک مرتبہ بھی اس کمرے میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ کتابوں کا بیشتر حصہ اس نے ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔ کتابوں کا نیا کمرہ اس نے لائبریری کی بنیادی ضرورتیں مدِنظر رکھ کر بنوایا تھا اور فرصت کے اوقات وہ عام طور پر اسی میں بسر کرتا تھا۔

پرانی لائبریری میں ایک الماری کے علاوہ کہیں بھی کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتابوں والی الماری کے پہلو میں وہ آرام کرسی پڑی تھی جس میں بیٹھ کر وہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر جا بجا سادہ اور رنگین تصویریں تھیں، ایک تصویر میں اس کے ٹیوٹوریل گروپ کے طلبا اور طالبات بیٹھے تھے۔ سب کے چہرے مسکرا رہے تھے سوائے ایک لڑکی کے جو اس سے کچھ دور سر جھکائے بیٹھی تھی۔

تصویر پر ایک سرسری نظر ڈال کر وہ کمرے سے نکلنے لگا کہ اُس کی نظر پھولوں کے ایک گلدستے پر جا پڑی۔

پھولوں کا یہ گلدستہ شیشے کے ایک گلدان کے اندر اس حالت میں نظر آ رہا تھا کہ کوئی پھول بھی دستبردِ وقت سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ گلی سڑی پتیاں گلدان کے آس پاس یوں بکھری پڑی تھیں جیسے میز کے اوپر چھوٹے چھوٹے دھبے نمایاں ہوں۔

اُس نے گلدان کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر یہ خیال کر کے پیچھے ہٹا لیا کہ گلدستہ کے رہے سہے پھولوں کی افسردہ اور پژمردہ پتیاں بھی بکھر جائیں گی۔

"یہ کسی نے کسی تقریب میں دیا ہوگا"

"کس نے؟"

اُسے اِس سوال پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

وہ لان میں آ کر وقت گزاری کی خاطر ٹہلنے لگا۔

غیر شعوری طور پر اُس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں چلا گیا۔ کئی لفافے اس نے باہر نکال لیے۔ یہ لفافے اُس کے دوستوں نے اپنے اُن مختلف ملکوں میں رہنے والے احباب کو لکھے تھے جن سے پروفیسر کرمانی کا تعارف مقصود تھا تاکہ سیر و سیاحت کے دوران اُسے سہولتیں میسر آ سکیں۔

ایک لفافے میں وہ تحریر تھی جس میں اُس کے کالج نیلو نے دنیا کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کچھ دن اپنے ہاں گزارنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ پروفیسر کا یہ دوست فیصل آباد میں رہتا تھا۔ اور اُس نے جواباً اپنے اس دوست کو اطلاع دے دی تھی کہ وہ کچھ وقت ضرور اُس کے ہاں گزارے گا۔ اور پروگرام کے مطابق اُسے کراچی جانے سے پیشتر فیصل آباد جانا تھا۔

"اچھا کیا ہے جو میں نے اِس کی بات مان لی ہے۔ جب بھی کبھی اِس سے ملاقات ہوئی ہے اس نے بڑے خلوص سے اپنے ہاں ایک دو ہفتے گزارنے کی دعوت دی ہے۔"

اس نے لفافوں کا بنڈل جیب کے اندر ڈال لیا۔

لان مختصر تھا اور سردی کی وجہ سے اس کے پودوں کے پھول مرجھا گئے تھے۔

مرجھائے ہوئے پھولوں کا بھی اپنا ایک حسن ہے، یہ سوچتے ہوئے اُسے پُرانی لائبریری کے گلدستے کا خیال آ گیا۔

ایک طرف کرسی سے اُس کی وہ چھڑی ٹنگ رہی تھی جسے ہاتھ میں لے کر وہ لان میں ٹہلا کرتا تھا۔

وہ چھڑی اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ نورانی کی آواز آئی۔

"جناب ٹیکسی۔"

"آ گئی۔ اچھا۔ اصغر سے کہو سامان رکھ دے۔"

نورانی چلی گئی۔

سامان ٹیکسی میں رکھ دیا گیا۔ اُس نے چائے کا کپ پی کر خالی کپ میز کے اوپر ٹکا دیا۔ اصغر اور نوراں اُس کے سامنے کھڑے تھے۔

"اچھی طرح مکان کی حفاظت کرنا۔" اِس قسم کی اور ہدایات انھیں دے کر اور خدا حافظ کہہ کر وہ

ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

سوا تین گھنٹے کا سفر طے کر کے وہ سٹیشن پر پہنچ گیا۔

دوست کے ہاں جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اُس نے جیب سے دوست کا لفافہ نکالا اور پتا پڑھا۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ چکا تھا۔ ایک بوڑھا شخص تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"کرمانی بھائی۔"

"دیکھ لو۔ آ گیا۔ کر دیا نا وعدہ پورا۔ حیران ہو گئے ہو زبیر! میرے آنے کی توقع نہیں ہوگی۔"

"یہی معاملہ ہے۔ اس لیے سٹیشن پر نہیں پہنچا۔ صاف کہتا بُرا مانا ہوگا۔" زبیر کے لہجے میں قدرے ندامت تھی۔

کرمانی اپنے پرانے دوست سے بے اختیار بغل گیر ہو گیا۔

"بُرا ماننے کی بھلا کیا بات ہے۔ یار زبیر! میرے ہم عمر ہو کر بوڑھے لگتے ہو۔"

"بوڑھا لگتا نہیں۔ سچ مچ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اندر چلو۔ اپنی روداد سناتا ہوں۔"

سجے سجائے ڈرائنگ روم میں دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ زبیر نے اپنی رُوداد سنائی۔

"میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں نے دو تین بیماریوں کو پال رکھا ہے۔ میرے کمزور ہونے کی یہ بڑی وجہ نہیں ہے۔ بیوی نے تین سال ہوئے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بڑھاپے میں ساتھی کا بچھڑ جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ اس سے مجھے سخت دھچکا لگا۔ تم کہو۔"

پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"میں کیا کہوں۔ اُس دنیا میں آیا ہی نہیں جس میں تم رہتے ہو۔"

"مجرّد ہو اب تک!"

"جی ہاں۔ بندے کو یہ فخر حاصل ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"بس زندگی کی بے تحاشا مصروفیتوں میں کسی کو تلاش کر کے اُسے اپنی دنیا میں لانے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ پھر بھی خوش ہوں۔"

"خوش ہو۔ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔ زندگی کے سارے مزے۔ سارے لُطف، سارے دکھ، سُکھ میاں بیوی ہی کے رشتے میں ہیں جن سے تم محروم ہو۔"

"محض ایک مفروضہ۔ کیا میں آج تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اس عمر میں میری بیوی فوت ہو جاتی تو مجھے بھی تمہاری طرح سخت دھچکا لگتا۔"

نوکرانی چائے لے کر آ گئی۔

پروفیسر نے چائے کے دو تین گھونٹ بھر کر پوچھا۔

"زبیر یار سا پتا نہیں مجھے یہ کیوں احساس ہو رہا ہے کہ تمہارے اس خوب صورت گھر میں بے رونقی ہے۔ جو ہونی نہیں چاہیے۔ تم نے اپنے خط میں بتایا تھا کہ دو لائق فائق بیٹوں کے باپ ہو۔ یہ لائق فائق بیٹے ملے نہیں۔ تمہاری بہوئیں —"

زبیر نے اس کا فقرہ مکمل نہ ہونے دیا۔

"یہی تو بگڑی ہے بھائی میرے — کہ بیٹے بڑے لائق فائق ہیں۔ جس ملک میں لائق فائق بنے اُس نے اُن کے پاؤں میں اعلیٰ عہدوں کی زنجیریں ڈال دیں۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا۔ مگر پھر انہوں نے بھی نئی زنجیریں ڈالنے میں تامل نہیں کیا۔"

"شادی کر لی۔"

"اور کیا۔ اپنی دونوں میم بہوؤں کو اپنے گھر میں صرف ایک ماہ تک دیکھا ہے۔ پھر چلی گئیں جدھر سے آئی تھیں کبھی کبھی خط لکھ کر یاد کر لیتی ہیں۔"

"تو اب گھر میں؟"

"ایک یہی اماں ہے۔ کھانا وغیرہ دے دیتی ہے۔ اور ایک خاتون ہے۔ میری دُور کی عزیزہ۔ جوانی کے عالم میں بے چاری بیوہ ہو گئی تھی۔ لے آیا تھا اپنے یہاں۔ مکمل طور پر ایک گھریلو عورت ہے۔ تمہارا کمرہ ٹھیک کر رہی ہے۔"

بقیہ وقت مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے، کالج کے زمانے کی باتیں یاد کرنے، پُرتکلف کھانا کھانے چائے پینے میں بیت گیا۔ شام کے وقت زبیر نے اُسے اپنے دوستوں سے ملایا، رات کا کھانا ایک ہوٹل میں کھا کر جب وہ گھر پہنچے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

"اب آؤ تمہیں تمہاری خواب گاہ میں پہنچا دوں۔"

کمرے کی ہر شے صاف ستھری تھی۔ فرنیچر قرینے سے رکھا ہُوا تھا۔

"یہ کمرہ میں نے مہمانوں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے مگر اب تک یہاں کوئی نہیں رہا۔ تم پہلے شخص ہو۔"

"پھر تو فخر کرنا چاہیے مجھے۔" پروفیسر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"فخر کی بات میرے لیے ہے کہ میرا بھولا بسرا دوست آج میرے مہمان خانے کی زینت بنا ہُوا ہے۔" زبیر نے بھی قہقہہ لگایا۔

"لو اب آرام کرو۔ بیٹی صبح سویرے یہیں ہو گی۔ شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

زبیر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں اُس پھولوں کے گلدستے نے اپنی طرف کھینچ لیں جو میز کے وسط میں پڑا تھا۔

گلدستہ بہت خوب صورت تھا۔ بہت پیارے پھول تھے اور انہیں ترتیب کے ساتھ سجانے میں بڑے سلیقے سے کام لیا گیا تھا۔

"یہ گلدستہ اماں نے تو [illegible] بنایا۔ اُس میں یہ سلیقہ مندی کہاں۔ یہ یقیناً اُس خاتون کا کام ہے جسے زبیر

اپنے ہاں لے آیا ہے۔"

اُس نے سوچا، اور یہ خیال کر کے اُسے حیرت ہوئی کہ اِس خاتون نے سارے دن میں ایک بار بھی اپنی ایک جھلک نہیں دکھائی تھی۔

"زبیر نے کہا تھا کہ مکمل طور پر ایک گھریلو عورت ہے، گھر کے کاموں میں مصروف رہی ہوگی۔"

وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ عام طور پر پلنگ پر لیٹنے کے بعد وہ جلد سو نہیں جاتا تھا۔ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا یا اپنی زیرِ تحریر تصنیف کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اُس نے کوئی بک شیلف ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ میز کے قریب ایک بک شیلف تھی۔

"تھوڑی دیر مطالعہ ہی سہی۔"

وہ بک شیلف کی طرف جانے لگا۔ ابھی اس کا ہاتھ ایک سنہری جلد والی کتاب کو چھو بھی نہیں سکا تھا کہ گلدستے نے پھر اُس کی نگاہیں اپنی گرفت میں لے لیں۔

اُس نے گلدان اٹھا لیا۔

گلاب کی بہتات تھی۔ کچھ اور پھول بھی تھے۔

چند لمحوں کے بعد اُس نے گلدان میز کے اوپر رکھ دیا اور کتاب اٹھا کر پلنگ پر آگیا۔

کتاب انگریزی شاعر کیٹس کی نظموں کا مجموعہ تھی۔ اپنے کالج کے زمانے میں اس نے کیٹس اور شیلے کا خصوصی مطالعہ کیا تھا۔ اِن دونوں کی شاعری اسے بہت پسند تھی۔

کیٹس کی مشہور نظم A THING OF BEAUTY پڑھنے لگا۔ معاً اُس کی نظر گلدستے پر پڑ گئی۔ اب وہ اسے ایک نئی کیفیت کے زیرِ اثر دیکھنے لگا۔

"یہ حسین تو ہے ہی لو ہے۔ بہت خوب صورت۔ کیٹس نے غالباً ایسا ہی کوئی گلدستہ دیکھ کر یہ غیر فانی نظم کہی ہوگی۔"

"یہ خاتون کیسی ہوگی جس نے یہ گلدستہ ترتیب دیا ہے۔"

اُس کا جی چاہا کہ اُسے دیکھے، اُس سے پوچھے۔ "یہ قسم قسم کے پھول تم نے کہاں سے لئے ہیں؟"

تین چار نظموں کے بعد اُس کی آنکھوں میں نیند کا غبار آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔
اُس نے کتاب تکیے کے نیچے رکھ دی۔ سوچ دبایا اور سو گیا۔
صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو پلنگ کے پاس تپائی کے اوپر ایک پیالی، چائے کا تھرموس اور چند بسکٹ پلیٹ پر پڑے تھے اور روشندان سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔
وہ چائے پینے ہی والا تھا۔
"جی صبح بخیر" ایک ہلکی سی مترنم آواز اس کے کان میں لہرائی۔
اُس نے اپنی دائیں جانب دیکھا۔
ایک دراز قد دُبلی پتلی خاتون جس کے بازوؤں پر بکھرے ہوئے بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے سے تار چمک رہے تھے۔ آنکھیں جھکائے کھڑی تھی۔
"چائے ٹھنڈی تو نہیں تھی؟" خاتون نے پوچھا۔
"بہت پُر لطف اور مزیدار ہے"
"کسی چیز کی ضرورت؟"
"بالکل نہیں"
وہ جانے لگی اور وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
چائے کا آخری گھونٹ بھر کر وہ تازہ اخبار دیکھنے لگا۔
اچانک اُس کی نگاہ سامنے پڑی۔ وہ خاتون نیا گلدستہ گلدان میں رکھ رہی تھی۔
"یہ پھول آپ کے باغیچے کے ہیں؟" اس نے یونہی پوچھ لیا۔
"جی نہیں۔ ہمارے باغیچے میں بہت کم پھول ہوتے ہیں۔"
"تو کہاں سے لائیں اتنے خوبصورت پھول؟ اور ہاں آپ کا نام کیا ہے؟"
وہ ذرا مسکرائی۔
"سرلے آئی۔ میرا نام امینہ ہے۔ اور کچھ؟"

کچھ نہیں شکریہ۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو پھولوں سے بڑی محبت ہے۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں ——" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

گلدستہ بدل کر وہ جانے لگی۔

دروازے پر پہنچ کر اُس نے ایک نظر گلدستے پر ڈالی۔ ایک لمحے کے لئے اُسے دیکھا اور باہر نکل گئی۔

"اُس کی نگاہوں میں یہ کرب کیوں تھا۔ یا شاید میں نے محسوس کیا ہے۔"

خاتون کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگا۔

ناشتے کی میز پر وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اُس کی طرف کوئی چیز بڑھاتے ہوئے۔ جب آنکھیں اوپر اٹھاتی تھی تو اُسے اُن آنکھوں میں بڑا گہرا کرب محسوس ہوتا تھا۔

تین دن بیت گئے۔ وہ اُس کے سامنے بہت کم آئی۔ آئی بھی تو رسمی طور پر کچھ کہنے یا کچھ پوچھنے:

صبح اسے اپنے دوست کے گھر سے چلے جانا تھا۔ سامان ٹیکسی میں پہنچ چکا تھا۔ اور وہ آخری بار کمرے کی دیواروں پر نگاہ ڈال کر، اٹیچی کیس اٹھائے قدم اٹھانے والا تھا کہ وہ آگئی۔ اُس نے ہاتھ میں ایک گلدستہ اٹھا رکھا تھا۔

"آپ کے لیے۔ پھول پسند ہیں نا آپ کو؟"

"بہت بہت شکریہ۔" اُس نے خوش دلی سے کہا۔

"قبول کر لیا ہے؟"

"کیوں نہیں —— اتنی خوب صورت چیز کون رُد کر سکتا ہے۔ مگر امینہ بی بی!"

"جی۔" اس کی آواز میں بڑی مایوسی تھی۔

"بڑا لمبا سفر ہے۔ میں اس بہت خوب صورت گلدستے سے ایک پھول نکالے لیتا ہوں۔ یہ میرے سینے پر رہے گا۔"

اُس نے گلدستے سے ایک پھول لے کر باقی گلدستہ اُسے واپس کر دیا۔

"لگا دیں آپ ہی۔"

امینہ نے گلدستہ میز پر رکھ کر ایک پھول اُس کے کالر کے نیچے لگا دیا۔

"شکریہ۔"

وہ چُپ رہی، اُن آنکھوں میں پھر وہی کرب ابھر آیا تھا۔ ایک ایسا کرب جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور اُن لمحوں میں وہ اس کرب پر غور کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"پروفیسر صاحب۔" وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گئی۔

"کہو۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو پہلے بھی کبھی کسی نے ایسا گلدستہ دیا تھا؟"

"مجھے ایسا گلدستہ؟"

وہ اسے بڑی بے تابی سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔"

"کبھی نہیں؟" امینہ کا لہجہ بے تابانہ تھا

ٹیکسی باہر ہارن دے رہی تھی۔

"آ رہا ہوں۔" اُس نے بلند آواز سے کہا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

کراچی ائیرپورٹ تک سفر مجموعی طور پر خوشگوار رہا۔ البتہ وہ چار لمحوں کے لیے امینہ کا کرب انگیز چہرہ اس کے سامنے آ جاتا تھا بالخصوص اُس کے یہ الفاظ آپ کو پہلے بھی کبھی کسی نے ایسا گلدستہ دیا تھا۔ اس کے ذہن میں لہرا جاتے تھے تو وہ قدرے بیقرار ہو جاتا تھا۔

"اُس کے کرب کی وجہ کیا ہے۔ اُس نے یہ فقرہ کیوں کہا تھا؟" ان لمحوں میں یہی سوال اسے مضطرب کیے دیتا تھا۔
دیتا تھا۔

ائیرپورٹ پر جا کر معلوم ہُوا کہ لندن کی فلائٹ ساڑھے تین گھنٹے لیٹ ہے۔ ڈپارچر روم یا پی آئی اے

کے ریستوران میں بیٹھ کر وقت گزارنے کی بجائے اس نے مناسب سمجھا کہ کراچی کی سڑکوں پر گھوما جائے اور وہ اپنا سامان ایئر پورٹ پر چھوڑ کر پیدل ہی چل پڑا۔

کلفٹن پر سمندر کے کنارے اُسے ایک کھوکھے کے قریب بیٹھ کر چائے پینے میں بڑا لطف آیا۔ دو کپ چائے پینے کے بعد تنہائی کے بیکار لمحے گزارنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں تھا اور ایسے میں انسان طرح طرح کے خیالوں میں ڈوب جاتا ہے۔

پھر وہی کرب انگیز چہرہ — پھر وہی فقرہ۔

اس نے یہ فقرہ کیوں کہا تھا — کیوں یہ سوال پوچھا تھا۔ مجھے کسی نے گلدستہ دیا تھا یا نہیں دیا تھا۔ اُسے اس سے کیا مطلب؟ وہ یہ بات کیوں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اور یہ سوال کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اتنی بے تابی کیوں بھر گئی تھی؟

زبیر نے اس کے بارے میں صرف یہی بتایا تھا کہ عین جوانی کے عالم میں بیوہ ہو گئی تھی اور وہ اُسے اپنی بیوی کی موت کے بعد اپنے یہاں لے آیا تھا۔ اس کا کرب اس کے اذیت ناک حالات کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کسی لڑکی کا جوانی میں بیوہ ہو جانا المیہ ہے۔ اور اس المیے ہی نے اسے یقیناً کرب آشنا کر دیا ہے مگر یہ سوال پوچھنے کی وجہ کیا تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے رسماً پوچھا ہو — رسماً پوچھا تھا تو اس کی بے تابی کیا کہتی تھی؟ اور جب وہ زبیر کے گھر سے رخصت ہو رہا تھا تو اُس نے گلدستہ ہی کیوں پیش کیا تھا اور جب اس نے اُس گلدستے سے ایک پھول الگ کر لیا تھا تو اُس کے چہرے پر ایک ایسی کیفیت کیوں چھا گئی تھی جیسے اُسے بڑا دُکھ ہوا ہے۔

"دکھ کیوں ہوا تھا اُسے؟"

امینہ کے الفاظ مسلسل اُس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ خیال کی لہر اُسے اُس افسردہ گلدستے تک لے گئی جسے اس نے اپنے گھر کے ایک پرانے کمرے کی میز کے اوپر دیکھا تھا۔

یہ گلدستہ اُس کی آنکھوں تلے پھر گیا۔

"یہ گلدستہ کہاں سے آیا تھا۔ کس نے اُسے دیا تھا۔ کب دیا تھا؟"

ان سوالوں کا وہ جواب نہیں دے سکتی تھا۔

وہ ماضی کے اندھیرے راستوں پر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی بیشتر زندگی کتابوں یا طالب علموں کی صحبت میں گزری تھی۔ تقریبات میں اُس نے بہت کم حصہ لیا تھا۔

"گلدستہ کسی تقریب ہی میں دیا جاتا ہے۔ اور میری زندگی میں کوئی ایسی تقریب آئی ہی نہیں۔"

اس کا یہی فیصلہ تھا۔" پھر وہ گلدستہ آیا کہاں سے تھا؟"

اُس کے قریب قہقہوں کی جھنکار ہوئی۔ کئی بچے اونٹ کے کجاوے میں بیٹھے تھے اور اونٹ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ لوگ باتیں کرتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ کھوکھے میں سے برتنوں کی کھنکھناہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ دور دھوپ میں پانی چمک رہا تھا۔

وہ چمکتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا۔ وہاں سے اس کی نگاہ دائیں جانب چلی گئی۔ تیز ہوا میں پھولوں کی شاخیں ہل رہی تھیں۔

پھولوں پر نظر پڑتے ہی گلدستے کا خیال پھر اس کے ذہن میں آ گیا اور اپنے ساتھ وہی سوال بھی لے آیا " وہ پرانا گلدستہ میرے کمرے میں کس نے رکھا تھا۔ کس نے دیا تھا۔ مجھ کو دیا ہوگا۔ مگر کب؟ کیوں؟"

اچانک اُس کی کلائی کی گھڑی سامنے آ گئی۔

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ دو گھنٹے ابھی باقی تھے۔

وہ وہیں بیٹھا رہا۔ خیالوں کی الجھی ہوئی ڈوری کچھ زیادہ ہی الجھ گئی تھی۔

رکشا کر کے وہ ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سامان کی حوالگی اور اپنی چیکنگ میں پندرہ بیس منٹ صرف ہو گئے۔ چند منٹ انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑا۔ اس کے بعد وہ بوئنگ میں تھا۔ اسے کھڑکی کے پاس جگہ ملی تھی۔

ایئرہوسٹس ٹرالی میں اخبارات لیے اُس کے قریب آئی۔

اُس نے خود ہی ایک اخبار اُٹھا لیا اور اسے گود میں رکھ کر باہر دیکھنے لگا۔

لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ رہے تھے۔ موسیقی جو اندر فضا میں تیر رہی تھی اُسے بڑی خوش آئند لگی۔

جہاز کے پنکھے حرکت کرنے لگے تھے۔ یہ حرکت تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے چہرہ کھڑکی سے ہٹا لیا۔ معاً نگاہ سینے پر لگے ہوئے پھول پر پڑی۔

"وہ گلدستہ کہاں سے آیا تھا۔ امینہ اس گلدستے سے واقف ہو گی۔ جبھی تو اس نے پوچھا تھا۔ آپ کو پہلے بھی کسی نے ایسا گلدستہ دیا تھا۔" اس کی سوچ پھر بیدار ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک یوریشین اور غالباً اس کی بیوی بیٹھے تھے۔ دونوں اخبار دیکھ رہے تھے۔

اُسے اخبار کا خیال آ گیا جو اُس کی گود میں پڑا تھا۔

اِن اخباری خبروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی نگاہیں ایک خبر سے دوسری خبر اور دوسری سے تیسری خبر تک پھسلتی رہیں۔

جہاز رن وے پر دوڑا جا رہا تھا۔

اُس کی انگلیاں صفحے پلٹتی رہیں۔ ایک صفحہ آگے آ گیا تو اُس کی انگلیاں تھم گئیں۔

یہ ایک فلمی اداکارہ کی بیٹی کی سالگرہ کی شاندار تقریب کی خبر تھی۔ اِس خبر میں جو مشہور اداکار، اداکارائیں اور شہر کی معروف شخصیتیں شامل ہوئی تھیں اُن کے نام درج تھے۔

تقریب کی تصویر میں گوٹے کناری والے کپڑے پہنے ایک بچی کیک کاٹ رہی تھی۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا "ثروت کی سالگرہ"۔

"سالگرہ" اس نے زیرِ لب کہا۔ اور اچانک اُسے یاد آ گیا۔ کہ مدتوں پہلے اُس کی بھی ایک بار سالگرہ ہوئی تھی۔ اس کے شاگردوں نے زبردستی یہ تقریب منعقد کر ڈالی تھی۔

بڑی شاندار تقریب تھی ہر طرف رنگین روشنیاں۔ مسکراہٹوں کی پھوار۔ قہقہوں کا طوفان برپا تھا، اُسے یاد آ گیا۔

پھر دھیرے دھیرے اُس کے ذہن کے طاق پر یادوں کے دیئے یکے بعد دیگرے جلنے شروع ہو گئے۔

ہر دیئے کی لَو راکھ کے ڈھیر میں ایک چنگاری کی طرح دہکنے لگی۔

تقریب کا نقشہ اس کے خیالوں میں جھلملانے لگا تھا:

کافی دیر تک ہنگامہ برپا رہا تھا۔

تقریب ختم ہونے لگی اور وہ مہمانوں کو رخصت کر کے واپس کمرے کی طرف آ رہا تھا تو اس کی ایک شاگردہ آ گئی۔

اُس کے ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا۔

"سر۔ آپ کے لئے" یہ لفظ کہتے ہوئے اُس نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔

"دیر سے آئیں"

گھنی پلکوں کے نیچے اس کی جھکتی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب، ایک مبہم، ایک نا آسودہ سی کیفیت تھی۔

"یہ امینہ۔ وہی تو نہیں — وہی ہے — وہی"

بے قراری کی شدت میں اس نے پہلو بدلا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا جوڑا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے پھر باہر دیکھا۔

جہاز چھوٹے چھوٹے مکان، پانی کی لکیریں پہاڑوں کے سلسلے "ٹا ٹا" پیچھے چھوڑتا ہوا آگے ہی آگے جا رہا تھا۔

خاندانی کرسی

ایئرپورٹ سے نکل کر جب وہ لاہور کی وسیع، شاداب اور خوبصورت سڑکوں سے اپنے بھتیجے کے ساتھ گزرنے لگا تو اُسے انیس (۱۹) برس کے پُرانے لاہور اور موجودہ لاہور میں کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا۔ کوئی بھی ایسی تبدیلی اُسے نظر نہ آئی جو پرانے لاہور سے نئے لاہور کو الگ کرتی۔ وہی سب کچھ تو تھا جو وہ کبھی کبھی کسی دوست سے ملنے یا صرف سیر و تفریح کی خاطر ان سڑکوں پر گھومتے ہوئے ان سڑکوں کے دو رویہ کھڑے ہوئے درختوں پر اور ان بارونق دکانوں پر بار ہا دیکھ چکا تھا۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے اور پورے انہماک سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اُس کے جوان سال بھتیجے نے اُس کے خیالات کا جائزہ لے لیا تھا اور اب اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"انکل! شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ لاہور تو وہی ہے۔"

"ہاں انور کچھ ایسی ہی سوچ میرے ذہن میں ہے۔"

انور نے سُرخ بتی دیکھ کر گاڑی روک لی تھی۔

"انکل تبدیلی دیکھنی ہو تو اپنے گاؤں میں چل کر دیکھئے۔"

"میرا گاؤں تبدیل ہو چکا ہے؟"

"بلکہ یہ کہئے کہ وہ گاؤں رہا ہی نہیں۔ وہ آپ کا انیس سال پہلے کا گاؤں کچھ اور بن چکا ہے۔"

"تو کیا بن چکا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"شہر نما قصبہ۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"تھوڑی دیر بعد آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔"

گاڑی کبھی سست رفتار سے چل رہی تھی اور کبھی تیز رفتار سے۔ شہری آبادی کی رونق میں کمی ہوتی جا رہی تھی۔ کہیں میدانی علاقہ تھا، کہیں کھیت ہی کھیت، کہیں کوئی ندی کہیں اِکا دُکا مکان۔ انکل متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد ابھی تک وہ اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا۔ کیا اُس کا بھتیجا کسی لمبے راستے سے تو نہیں اپنی گاڑی لے جا رہا۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگا۔

"انور!"

"جی۔ انکل۔"

"تم کدھر سے چلے جا رہے ہو۔ ابھی کتنی دُور ہے ہمارا گاؤں؟"

انور ہنس پڑا۔

انکل کو یہ بات کی ہنسی بُری لگی۔

"انکل! ہم اپنے گاؤں میں چلے جا رہے ہیں۔"

"یہ ہمارا ہی گاؤں ہے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا جس میں اضطراب کا جذبہ غالب تھا۔

"انکل! میں نے عرض کیا تھا۔ ناکہ اب ہمارا گاؤں شہر نما قصبہ بن چکا ہے۔"

انور نے گاڑی روک لی تھی تاکہ اُس کا انکل اُس جگہ کو دیکھ لے جہاں سے وہ گزر رہے تھے۔

انکل جب اُس جگہ رہتا تھا تو گاؤں کے ابتدائی حصے میں چھکڑے، تانگے اور ریڑھیاں بے ترتیبی کے عالم میں نظر آتی تھیں۔ اِن کے نیچے ہر وقت کیچڑ رہتی تھی۔ اِن سے کچھ دور جھگیاں ہوتی تھیں، کچے مکان ہوتے تھے جن میں گاؤں کے کھیت مزدور رہتے تھے۔ یہ سب کچھ کہاں غائب ہو گیا۔

تھا۔ کیا انور کسی اور راہ سے تو نہیں گاؤں میں داخل ہوا۔ مگر اسے فوری طور پر خیال آگیا کہ گاؤں کے اندر جانے کا تو صرف ایک ہی راستہ تھا جو چھکڑوں، تانگوں اور رہڑھیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔

"انور تم کسی اور راستے سے آئے ہو؟"

"اور تو کوئی راستہ ہے ہی نہیں انکل!"

"تو وہ چھکڑے۔۔؟"

انکل کا بقیہ فقرہ بھتیجے کے پُر زور قہقہے میں ڈوب گیا۔ قہقہے کے اختتام پر کہنے لگا۔" وہ چھکڑے وغیرہ یہاں کہاں۔ انکل اب یہ آپ کا پرانا گاؤں نہیں رہا۔"

گاڑی اب آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک بڈھا، سر پر بڑا سا پگڑ، آنکھوں پر عینک، خراماں خراماں ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ انکل کو اُس کے چہرے کے خدوخال میں کوئی شناسا علامت دکھائی دی۔

"یہ موجو نمبردار تو نہیں؟"

"وہی ہے ۔۔ اب یہ نہیں اِس کا بڑا بیٹا نمبردار ہے۔"

پُرانے نمبردار نے گاڑی کو دیکھا اور کسی قدر دوری سے سلام کے انداز میں دایاں ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

"کیا یہ کوئی بڑا آدمی بن گیا ہے؟" انکل نے حیرت سے پوچھا۔ اِس کے جواب میں انور صرف مُسکرا دیا۔

ایک کالا بھجنگ آدمی حقہ ہاتھ میں لئے چلا جا رہا تھا۔

"یہ ہماری چلمیں بھرنے والا کالو تو نہیں؟"

"انکل پہچان لیا اسے؟"

"اِس جیسا خوب صورت آدمی اور کون ہوگا سارے گاؤں میں؟"

انور کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔ اسے اپنے انکل کا طنز شاید پسند نہیں آیا تھا۔

"انکل! اب یہ جلیبیں نہیں بھرتا۔ شان سے کھیتی باڑی کرتا ہے"۔

گاڑی ایک حویلی کے سامنے رک گئی۔

"پہچانا اپنی پرانی حویلی کو؟"

انکل حیرت زدہ نگاہوں سے حویلی کو دیکھ رہا تھا۔

"لگتی تو وہی ہے پر ویسی رہی نہیں"۔

"دیکھ لیجئے ہمارے کام"۔

دونوں گاڑی سے اُتر چکے تو انور نے جلدی سے حویلی کے دروازے پر پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ "انکل آ گئے ہیں"۔ یہ آواز فضا میں گونج ہی رہی تھی کہ دروازے پر عورتیں اور بچے آ گئے۔ سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ ان سب نے انکل کو گھیرے میں لے لیا بچے انکل سے لپٹ گئے اور "تایا جی آ گئے۔ تایا جی آ گئے"، کا شور مچانے لگے۔ عورتیں خاموش تھیں مگر ان کی نگاہوں میں حیرت اور خوشی بے اختیار چھلک رہی تھی۔

جیسے ہی انکل حویلی کے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا اُس کے اردگرد کئی عورتیں جمع ہو گئیں سب کے ہونٹوں پر صرف ایک ہی سوال تھا۔

"بھائی جان آپ گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟"

"بس چلا گیا تھا"۔

"انکل آپ نے کسی کو پہچانا بھی ہے"۔ اور انکل کی نظریں عورتوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگیں۔ ایک طرف اُسے ایک مانوس سا چہرہ دکھائی دیا جو ایک نوجوان لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنا سر ہلا رہی تھی۔

"بھابھی؟"

"پہچان لیا بھائی جان نے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑی اور اس کے سر سے چادر اُتر گئی۔

"یہ میری بیٹی نجمہ ہے۔ آپ چلے گئے تھے تو پیدا ہوئی تھی"۔

انکل نے اُس کی بیٹی کو دیکھا۔ جس کا دوپٹہ اُس کے گلے میں پڑا تھا۔ اُس کے زمانے کی لڑکیوں کے سر تو بھاری بھاری چادروں سے ڈھکے رہتے تھے۔

شام کے کھانے پر ڈائننگ ٹیبل کے گرد کرسیوں پر گاؤں کے کم و بیش سارے معززین جمع تھے اور انکل کو یہ بات عجیب سی لگی کہ اِن لوگوں میں وہ آدمی بھی شامل تھے جو ایک زمانے میں اُن کے کھیتوں میں کام کر چکے تھے۔ اُسے زیادہ حیرت اِس امر پر تھی کہ اُس کے بھتیجے نے ان کا تعارف عزت احترام کے ساتھ کرایا تھا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

"اب چائے پی جاتی ہے؟"

"ہاں انکل! شہروں میں چائے پی جاتی ہے تو آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ اِس سے محروم رہیں؟"

رات کے دس بجے انکل کو اس کی سجی سجائی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا، صاف ستھرا بستر، دیواروں پر رنگا رنگ تصویریں، زمین پہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دری بچھی ہوئی — اس کے اُوپر میز، صوفہ سٹ، کرسیاں۔ ایک طرف تپائی کے اُوپر خوبصورت لیمپ، جس کی روشنی سارے کمرے میں پھیلی ہوئی۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ اُسے اجنبی اجنبی سا غیر مانوس سا لگ رہا تھا۔

"گاؤں میں بجلی آ گئی ہے۔ دس پندرہ روز تک ہماری حویلی میں بھی لگ جائے گی۔" اُس کے بھتیجے نے بتا دیا تھا۔

وہ پلنگ کے اُوپر تکیے سے پشت لگائے نیم دراز تھا۔ اُس کے سامنے لمبے صوفے پر انور اور اس کی جواں سال بیوی صفیہ بیٹھی تھی، دونوں بچے الگ الگ صوفوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ انور کے پوچھنے پر وہ اُسے بتا رہا تھا کہ آج سے بیس برس پیشتر وہ کس طرح ایک تجارتی فرم کے ساتھ کلکتے چلا گیا تھا، پھر کئی سال بنارس اور مدراس میں اِس فرم کا کام کرتا رہا تھا۔ سب اُس کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔

"انکل! کبھی گھر کی یاد آپ کو نہیں آئی تھی؟"

"کیوں نہیں، ہر سال سوچتا تھا کہ اگلے سال اپنے گاؤں چلا جاؤں گا مگر یہ پروگرام پورا نہیں ہوتا تھا۔"

"انکل! جب آپ یہاں تھے تو اِس گھر میں صرف امی تھیں اور میں تھا۔ آپ کے جانے کے تین

سال بعد امی کا انتقال ہوگیا۔ سال بعد میری شادی ہوگئی۔ پھر اکبر اور عامر آگئے۔"

"پیارے بچے ہیں۔" انکل نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ دونوں مسکرانے لگے۔

گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ باتیں ہوتی رہیں۔ انور اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔

"مجھے اپنے ایک دوست کے ہاں بیمار پُرسی کے لئے جانا ہے۔ شام کے بعد ضرور اس کے ہاں جاتا ہوں۔ انکل! آپ تھک چکے ہوں گے۔ سو جائیں۔"

اور یہ کہہ کر انور کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اُس کی بیوی اور بچے بھی چلے گئے۔

اب وہ کمرے میں تنہا تھا۔

اُس نے لیمپ کی بتی نیچی کر کے سونے کی کوشش کی مگر نیند تو جیسے اُس کی آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔

وہ نیم تاریک نیم روشن کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ پھر پلنگ پر گر پڑا۔

صبح سویرے ہی خاموشی سے ناشتا کیا گیا۔ ناشتے کے بعد انور اپنے روزمرہ کام کاج کے لئے چلا گیا اور اپنی بیوی سے کہتا گیا۔ "انکل کو ذرا گھر کی سیر کرا دینا۔" اور انکل نے یکے بعد دیگرے سارے کمرے دیکھ لیے۔ اُس نے سارے کمرے دیکھنے کے بعد پوچھا۔

"صفیہ بیٹی!"

"جی انکل۔"

"اس گھر کے ہر کمرے سے مجھے کسی قدر اپنائیت محسوس ہوئی ہے۔ مگر یہاں ایک کمرہ ایسا بھی تھا جس میں میری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔"

"انکل وہ انہی کمروں میں سے کوئی ہوگا۔"

"نہیں صفیہ! وہ میرا کمرہ تھا وہاں آج بھی میری چیزیں ہوں گی۔"

"آپ کو تمام کے تمام کمرے تو دکھا دیے ہیں۔" صفیہ نے لقینی لہجے میں کہا۔ امی! وہ کمرہ تو

نہیں دکھایا جس میں فضلو چوکیدار رہتا تھا۔ اس نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

صفیہ نے گھور کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

"یہ کمرہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"انکل! کیا دیکھیں گے اُس کے اندر جا کر۔ فضلو کے جانے کے بعد اس میں گھر کی ساری فضول اور بے کار چیزیں بھر دی گئی تھیں۔ برسوں سے اُسے کسی نے کھولا ہی نہیں۔" صفیہ نے انکل کو ٹالنا چاہا۔

"دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

"انکل اِتنے بُرے کمرے میں جا کر کیا کریں گے۔ ہر شے گرد و غبار سے اٹی پڑی ہو گی۔ اس کی تو کھڑکیاں بھی کسی نے کبھی نہیں کھولیں۔"

"پھر بھی کوئی حرج نہیں۔"

صفیہ نے دایاں ہاتھ اس انداز سے ہلایا جیسے کہ رہی ہو۔ "آپ کی مرضی۔"

وہ کمرہ مکان کے کسی کمرے سے ملحق نہیں تھا بلکہ آخری کمرے سے ذرا فاصلے پر تھا۔ ان دونوں کے درمیان نالی کا پانی بہ رہا تھا، اینٹوں کے کچھ ڈھیر تھے۔ جم کر پتھر بنا ہوا سیمنٹ تھا اور گلی سڑی بوریاں تھیں۔

کمرے کا دروازہ مقفل نہیں تھا مگر سالہا سال تک بند ہونے کی وجہ سے اسے کھولنے میں وقت پیش آ رہی تھی۔

"چھوڑیے انکل آپ کس وہم میں پڑ گئے ہیں۔ کنڈی زنگ آلود ہو چکی ہے۔ کھلے گی نہیں۔" مگر انکل پر صفیہ کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اکبر سے کہہ کر باورچی خانے سے حمام دستہ منگوا لیا اور کنڈی پر زور زور سے ضربیں لگانے لگا۔ آخر کار کنڈی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

ہر طرف گھپ اندھیرا، کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدبو کے بھبھوکے اُس کے دماغ کو چھو رہے تھے۔ سینے میں سانس جیسے رک سی گئی تھی۔ اُسی لمحے صفیہ کی چیختی ہوئی آواز گونجی۔ وہ اپنے بیٹوں کو زور

جانے سے بڑی سختی کے ساتھ منع کر رہی تھی۔

وہ کھڑا تھا۔ مبہوت، سراسیمہ، آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی مگر نگاہیں اِن کھلی ہوئی آنکھوں میں منجمد۔

"صفیہ!"

"جی، انکل"۔ صفیہ کی دروازے کے باہر سے آواز آئی۔

"بڑا اندھیرا ہے"۔

"یہ تو ہوگا ہی۔ برسوں سے بند پڑا ہے"۔

"لیمپ نہیں لے آئیں بیٹی؟"

"آپ دیکھنا کیا چاہتے ہیں یہاں — خیر، آپ کی مرضی"۔

وہ اندھیرے میں کھڑا رہا۔ اس کے سر پہ بوجھ پڑ رہا تھا۔ یہ مٹی تھی جو چھت سے گر رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اُس کے پاؤں کسی بھاری بھر کم چیز کے آگے آنے سے رک گئے۔

صفیہ لیمپ لے کر دروازے پہ پہنچ گئی تھی۔ وہ کمرے کے اندر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیمپ اُس نے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ لگتا تھا یہ لیمپ کی روشنی اندھیرے کے سمندر میں ڈوبنے لگی ہے۔ دھیرے دھیرے اُسے کچھ کچھ نظر آنے لگا۔

ٹوٹا پھوٹا فرنیچر، اینٹوں کے ڈھیر، پھٹے پرانے کپڑے۔ آہستہ آہستہ کچھ چیزیں اپنے مبہم سے سایے اُس کی بصیرت پر ڈالنے لگیں۔

وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے ڈیلے پھیل گئے۔ ایک سنسنی سی اُس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ اُس کی نظریں کمرے کے ایک کونے میں جیسے جم کر رہ گئیں۔

یہ ایک کرسی کی شکل کی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔

وہ اپنے پاؤں کے سامنے آنے والی چیزوں کو روندتا ہُوا اس کونے کی طرف جا رہا تھا۔

دروازے پر کھڑی صفیہ اس کی اِس حرکت پر حیران ہو رہی تھی۔

وہاں پہنچ کر اس کے قدم رک سے گئے اور اُس کا سر بے اختیاری کے عالم میں جھکنے لگا۔

"انکل کو کیا ہو گیا ہے۔ پاگل تو نہیں ہو گیا؟" صفیہ سوچ رہی تھی۔

وہ اپنا ایک ہاتھ کرسی کے اوپر پھیر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے لیمپ تھام رکھا تھا۔

"صفیہ!"

"جی انکل۔"

"کیا نام ہے تمہارے نوکر کا۔ بلاؤ اُسے۔"

غنی لڑکوں کے ساتھ باہر ہی کھڑا تھا۔ انکل کی آواز سُن کر وہ دروازے پر آ گیا۔

"بلایا ہے؟" اُس نے پوچھا

"جی میاں صاحب میں آ گیا ہوں۔" غنی نے اونچی آواز میں کہا۔

"اندر آؤ۔"

غنی نے قدم اندر رکھا مگر یہ دیکھ کر کہ اُس کے پاؤں مٹی میں دھنسے جا رہے ہیں، وہیں ٹھہر گیا۔

"حکم کیا ہے میاں جی؟"

"اِدھر آؤ۔" انکل کے لہجے میں درشتگی تھی۔

غنی نے صفیہ کی طرف دیکھا جو خاموش کھڑی تھی۔

"کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

غنی کے اِس فقرے پر انکل نے لیمپ والا ہاتھ بلند کر دیا اور غنی گرتے پڑتے گرد و دھول کے بعد وہاں پہنچ گیا۔

"دیکھو اِس کرسی کے اٹھانے میں میری مدد کرو۔"

"جی؟" غنی کو اتنی حیرت ہوئی کہ وہ "جی" کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

انکل کرسی اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ناچار غنی کو بھی اُس کا ساتھ دینا پڑا اور چند منٹ کے بعد وہ گرد و غبار میں اَٹی کرسی حویلی کے ڈرائنگ روم میں تھی۔

وہ اپنے صاف ستھرے رومال سے اس طرح کرسی صاف کر رہا تھا کہ فرطِ احترام سے بار بار اس کا ہاتھ رک جاتا تھا۔ کئی بار اس نے کرسی کے بازوؤں کو، اس کی پشت کو چوما تھا اور کمرے کے باہر صفیہ، غنی اور دونوں لڑکے انتہائی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

شام ہو گئی تھی جب انور گھر آیا۔ حویلی میں ہر طرف روشنیاں پھیل چکی تھیں۔

وہ سب سے پہلے انکل سے ملنے کے لیے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

انکل اسی کرسی کے نیچے قالین پر بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے میں محو تھا۔

ڈرائنگ روم کے قیمتی اور خوب صورت فرنیچر کے درمیان ایک انتہائی بوسیدہ، پرانی، بدوضع کرسی دیکھ کر اس کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔

"انکل! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ فضول شے کہاں سے اٹھا لائے ہیں آپ؟"

"وہاں سے جہاں تم نے اسے پھینک کر احسان فراموشی اور بے قدری کی تھی" انکل اٹھ بیٹھا "تم بچے تھے، اپنے بزرگوں کو تم نے اس کرسی پر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں دیکھ چکا ہوں، اپنے دادا جان کو بھی۔ اپنے ابا جان کو بھی۔ اس کرسی کا اپنا رعب داب تھا۔ لوگ آتے تھے تو اس کی طرف اپنی پشت نہیں کرتے تھے۔ اس قدر احترام کرتے تھے وہ سب لوگ اس کا۔ یہ کرسی ہمارے خاندان کا بے بہا ورثہ تھی۔ تم نے اس کی قدر نہ پہچانی اور اسے ردی چیزوں میں پھینک دیا۔"

انکل نے شدید جذباتی لہجے میں یہ الفاظ کہے اور اس کی خفگی آمیز نظریں اپنے بھتیجے کے چہرے پر شعلہ زنی کر رہی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں انکل آپ! وہ زمانہ لد گیا ہے۔"

"زمانہ لد گیا ہے مگر خاندانی ورثہ تو موجود ہے۔ یہ ہماری خاندانی کرسی ہے۔"

"دیکھیے انکل!" اب انور کا لہجہ نرم اور مصالحت آمیز تھا: "گاؤں کے سارے معزز لوگوں کو

آپ کی آمد کا علم ہو چکا ہے۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے آئیں گے ۔میں نے یہ قیمتی فرنیچر ہزاروں روپے خرچ کر کے خرید لیا ہے ۔ یہاں کسی حویلی میں بھی ایسا شاندار فرنیچر نہیں ہے ۔اِس شاندار فرنیچر میں یہ بدنما ، فضول اور بے کار کرسی کیا کہیں گے یہ لوگ ۔ انکل ؟“

”یہ کرسی یہیں رہے گی ؟“ انکل کے فقرے سے اُس کے مصمم ارادے کا اظہار ہو رہا تھا ۔

ان لمحوں میں صفیہ آ گئی ۔

” اس وقت آپ باہر چلئے ۔“ اور وہ اپنے شوہر کو باہر لے گئی ۔

”اس وقت انکل پاگل ہو گئے ہیں ۔کرسی ڈرائنگ روم سے ہٹا کر صحن میں رکھوا دیتے ہیں ۔ آپ انھیں کہیں باہر لے جائیں ۔“ صفیہ نے کمرے سے باہر نکل کر شوہر کو مشورہ دیا ۔

رات کے ساڑھے نو بجے تک انور انکل کو اِدھر اُدھر لیے پھرا ۔اس نے گاؤں کے سارے حصے اُسے دکھا دیے ۔مگر واپس آ کر ، کھانا کھانے کے بعد انور انکل کو خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور انکل سے کہا کہ آپ تھک چکے ہیں ۔ سو جائیں جا کر ۔“ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے لگے ۔ پھر رات بیت گئی ۔

حویلی میں سب سے پہلے غنی بیدار ہوتا تھا ، وہ ناشتے کا سامان لاتا تھا اور جب صفیہ کمرے سے باہر آتی تھی تو باورچی خانے میں سارا سامان موجود ہوتا تھا ۔ مگر اس صبح وہ انور کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا ۔

یہ ایک خلافِ معمول واقعہ تھا ۔ انور آنکھیں ملتا ہوا باہر آ گیا ۔

”کیوں غنی ؟“ غنی کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔

”ہوا کیا ہے ؟“

غنی چپ چاپ ایک طرف چلنے لگا اور انور اُس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگا ۔

دونوں دالان میں پہنچ گئے تھے ۔

انور کی حیرت زدہ نگاہیں ایک عجیب منظر دیکھ رہی تھیں ۔ اُس کا انکل خاندانی کرسی میں

بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اوس کے قطرے اس کے بالوں پر چہرے پر، کپڑوں پر چمک رہے تھے۔

"انکل، انکل" انور نے بار بار پکارا مگر انکل کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی، اس کے جسم کو کوئی حرکت نہ ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد انور اور غنی نے مردہ انکل کو اٹھا کر اندر ایک کمرے میں پلنگ پر لٹا دیا اور اسے چادر سے لپیٹ دیا۔

ساری حویلی کی فضا میں ایک ماتمی سناٹا چھایا ہوا تھا اور سورج نصف النہار پہ آچکا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔

اتنے میں غنی نے آکر بتایا۔

"جی مولوی صاحب آگئے ہیں — میت کو نہلانے کے لیے گرم پانی چاہیے۔"

"تو لے آؤ لکڑیاں۔"

"میاں جی ایندھن کا ٹال بند ہے۔"

انور کچھ سوچنے لگا۔ وہ ایک آدھ منٹ سوچتا رہا۔

"غنی۔ وہ دالان میں پرانی کرسی پڑی ہے نا — اسے توڑ کر چولھے میں جلا دو۔"

غنی دالان کی طرف جانے لگا۔ اور انور ان لوگوں کی جانب بڑھا جو اس کے انکل کی موت کی خبر سن کر اظہار افسوس کے لیے حویلی میں آگئے تھے۔

خُون کی ایک بوتل

ڈاکٹر ابھی ابھی راؤنڈ کر کے باہر نکل تھا۔ ماں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید وہ سو چکی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ذرا اِدھر اُدھر گھوم پھر آئے اور وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ دروازے سے کچھ دور رہی تھا کہ نرس جو ڈاکٹر کے ساتھ باہر گئی تھی تیزی سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رُوک لیا اور اپنی چھوٹی سی ڈائری میں سے ایک ورق پھاڑ کر اُسے دینے لگی۔

"یہ کیا ہے مِس؟"

"خون کی بوتل چاہئے آپ کی ماں کے لیے۔"

"اچھا جی۔"

"بلڈ بینک سے ملے گی۔ نیچے اُتریئے۔ دائیں کونے میں یہ بینک ہے۔ وہاں شفیق صاحب ہوں گے، ان سے کہئے اِس کا انتظام کر دیں۔" یہ کہہ کر نرس دور دے جھپٹتی ہوئی ایک مریضہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہ نیچے اترا۔ نرس کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق بلڈ بینک کے سامنے پہنچ گیا۔ اُسے اِس بات پر اطمینان تھا کہ بوتل کی وہ ہر قیمت ادا کر سکتا ہے۔ جب سے اس کی ماں ہسپتال میں داخل ہوئی تھی وہ ہر روز اپنی ابّی سے تین چار سرخ نوٹ لے کر جیب میں محفوظ کر لیتا تھا اس وقت بھی اس کے پاس تین نوٹ موجود تھے۔

اندر گیا تو دیکھا چاروں طرف ریفریجیٹر پڑے ہیں اور درمیان میں ایک صاحب اوراُل پہنے، آنکھوں پر دبیز شیشے کی عینک لگائے کھڑے ہیں اور ایک رجسٹر کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔

"شفیق صاحب سے ملنا ہے۔"

"فرمائیے۔"

"جی یہ مس نے دیا ہے۔" اور اُس نے کاغذ اُن کے سامنے کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے کاغذ پر نظر ڈالی گئی۔ پھر کاغذ میز پر رکھ کر وہ دوبارہ رجسٹر کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دیر ورق گردانی کرنے کے بعد انہوں نے رجسٹر بند کر دیا اور اس کی طرف مخاطب ہوئے۔

"کس کے لیے بوتل چاہیے آپ کو؟"

"جی میری ماں بیمار ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت اس نمبر کے خون کی بوتل بلڈ بینک میں نہیں ہے۔"

"تو اب کیا کیا جائے؟" اُس نے پوچھا۔

"آپ کو زحمت کرنی ہے یہ بوتل باہر سے لینی ہو گی۔"

وہ مضطرب ہو کر اُن صاحب کو دیکھنے لگا۔ اُن کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"مسٹر کیا نام ہے آپ کا؟"

"جی داؤد۔"

"ہاں تو داؤد صاحب بلڈ بینک میں وہی خون ہوتا ہے جو بلڈ ڈونرز بطور عطیہ کے دے جاتے ہیں کبھی کبھی کسی خاص نمبر کا خون ہمارے ہاں نہیں ہوتا۔ ایسے خون کے ضرورت مند کو اس کا انتظام باہر سے کرنا ہوتا ہے۔ سمجھ لیا آپ نے؟"

شفیق صاحب نے بات پوری وضاحت سے کر دی تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ باہر سے ان کی مراد کیا ہے۔

"جی میں کچھ جانتا نہیں ہوں"۔

"ٹھیک ہے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ یوں کریں۔ میں ایک شخص کا نام پتا آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ وہ پروفیشنل آدمی ہے۔ کئی بوتلیں بیچ چکا ہے۔ اس کے یہاں چلے جائیں۔ قیمت تو وہ خاصی مانگے گا۔ تاہم اپنی ضرورت کی بوتل آپ کو مل جائے گی۔

یہ کہتے ہوئے شفیق صاحب نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی کاپی نکالی، اُس کے چند ورق پلٹے۔

"پتا میں لکھے دیتا ہوں" ــــ اور وہ اسی کاغذ پر جس پر نرس نے 'بلڈ نمبر' لکھا تھا، پتا لکھنے لگے اور ساتھ ساتھ بولتے بھی گئے۔

عبدالقادر۔ مکان نمبر ۱۲۔ محلہ سیمیاں، نزد عطار چنن دین۔

پتا لکھ کر انہوں نے کاغذ داؤد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جائیے وہ اس وقت گھر پر مل جائے گا"۔

ایک زمانے میں وہ ٹکسالی دروازے میں رہ چکا تھا اور اپنی آوارہ گردی کے دوران کئی بار بازار سیمیاں سے گزرا تھا۔ البتہ عطار چنن دین کی دکان تک پہنچنا ذرا مشکل تھا۔ تاہم یہ مشکل بھی دور ہو گئی۔

اس نے بوڑھے عطار سے عبدالقادر کا مکان پوچھا۔

"سامنے جو چھوٹی سی گلی ہے نا اس کا آخری مکان عبدالقادر کا ہے"۔

اُس نے شکریہ ادا کیا اور چند منٹ کے بعد ایک یک منزلہ مکان کے نیچے کھڑا تھا۔

دروازے پر دستک دی تو ایک درمیانی عمر کا آدمی نیچے آ گیا۔

"فرمائیے کیا حکم ہے؟" آنے والے نے پوچھا۔

"مجھے بلڈ بینک کے انچارج نے بھیجا ہے۔ خون کی ایک بوتل چاہیے"۔

"نمبر پوچھ لیا ہے؟"

داؤد نے جیب سے کاغذ نکال کر اس کو دے دیا۔

"نمبر بالکل ٹھیک ہے۔"

"تو فرمائیے۔" داؤد نے پوچھا۔

"ہزاروں میں سے دو چار آدمیوں کے خون کا یہ نمبر ہوتا ہے۔"

"مجھے اپنی بیمار ماں کے لیے چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ دو سو لگیں گے۔"

"بہتر جناب۔" اُس نے کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

"کل گیارہ بجے پہنچ جاؤں گا۔ آپ ساڑھے گیارہ بجے بینک کے پاس ملئے۔ ہاں آدھی رقم پیشگی ہوگی۔"

داؤد نے چپ چاپ سو روپیہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ واپس ہسپتال گیا۔ ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور تپائی پر بیٹھ گیا۔

گھر میں اس کی بڑی بہن ہوتی تھی جو دو تین سال سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ دو بچے تھے۔ بڑا لڑکا تھا نو سال کا اور چھوٹی لڑکی تھی جس کی عمر سات برس تھی۔ اور کوئی تھا نہیں۔ باپ کو مرے ہوئے آٹھ سال بیت چکے تھے۔ اِس لیے جب سے ان کی ماں خطرناک بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہوئی تھی دن کو تو داؤد ماں کے پاس رہتا تھا اور رات کو اس کی باجی آجاتی تھی اور وہ بچوں کے پاس گھر چلا جاتا تھا۔

گیارہ روز ہو چکے تھے اور ماں کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی تھی۔ عام طور پر نیم بیہوشی رہتی تھی۔

دوسرے روز لو نے بارہ بجے عبدالقادر بلڈ بینک کے پاس مل گیا۔

"بوتل بینک میں آچکی تھی۔ نرس سے کہہ کر منگوالیں بلکہ ضرورت کے وقت وہ خود ہی منگوالے گی۔"

"شکریہ، لیجئے اپنی رقم۔"

اور داؤد نے سو روپے اُس کے حوالے کر دیے۔

دو دن بعد ماں ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔

کئی دن بعد جب وہ رو دھو کر غم برداشت کرنے کے قابل ہو گئے تو انھیں از سرِ نو زندگی کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جب تک باقاعدہ آمدنی کی صورت پیدا نہیں ہوگی شب و روز بسر نہیں ہو سکتے۔ تاہم داؤد اپنی جگہ مطمئن تھا کہ قالینوں کی جس دکان میں بطور سیلز مین کے کام کرتا تھا اس کا مالک اُس کی دیانت داری پر خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ جیسے ہی مالک سے ملے گا وہ اسے کام کرنے کا موقع دوبارہ دینے میں قطعاً کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اِس یقین کے ساتھ جس وقت وہ دُکان میں داخل ہُوا تو دو نئے آدمیوں دیکھ کر اس کا ماتھا وہیں ٹھٹکا۔

مالک اس سے بہت اچھی طرح ملا۔ اس کی ماں کے انتقال پر گہرے غم کا اظہار کیا اور اسے صبر کی تلقین کی اور پھر دوسری باتیں کرنے لگا کہ پچھلے دنوں کاروبار میں خاصا نقصان ہُوا — اور اس کی نئی کوٹھی ادھوری پڑی ہے۔

داؤد حیران تھا کہ وہ اصل معاملے کی طرف کیوں نہیں آتا۔ آخر کار اس نے خود ہی کہہ دیا۔

"تو شیخ صاحب! میں کل سے ڈیوٹی پہ آنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ فرم نے مجبور ہو کر دو آدمی رکھ لئے ہیں۔ اب کسی کی گنجائش ہرگز نہیں۔ کچھ مدت ٹھہر جاؤ، اللہ مالک ہے۔"

جواب بالکل واضح تھا، اب اِس سلسلے میں کچھ کہنا سُننا فضول تھا۔ داؤد پھر کسی روز آنے کا کہہ کر دکان سے باہر آ گیا۔

اس دن اس کی تگ و دو یہیں تک رہی۔ اصل میں دکان کے مالک نے اُسے اس درجہ مایوس کر دیا تھا کہ وہ کہیں اور جگہ نہ جا سکا۔ دوسرے دن وہ اپنے دوستوں کے یہاں مختلف دفتروں میں پہنچا۔

کہیں تو وعدۂ فردا سُنا اور کہیں معذرت کے چند لفظ۔ شام تک بیکار دوڑ دھوپ میں اپنی توانائی صرف کرتا رہا۔ گھر آکر مضمحل اور نڈھال ہو کر بستر پہ گر پڑا۔ اس کی باجی بھائی کی حالت کا اندازہ لگانے میں ناکام نہ رہی۔ بولی۔

"داؤد اتنے مایوس کیوں ہو۔"

"باجی۔ جہاں جہاں کچھ امید تھی وہاں گیا" داؤد فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

"تو ہوا کیا۔ کوشش کرتے رہو۔"

وہ کوشش کرتا رہا۔ معمولی سی نوکری کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

باجی نے چوری چھپے جو زیور بچ گئے تھے، ایک ہمسائے کے توسط سے بیچ دئیے اور یوں گھر کا خرچ چلتا رہا۔

ناکام تگ و دو میں تین ماہ بیت گئے۔ پھر اُسے ایک فرم میں حساب کتاب رکھنے کے لئے پارٹ ٹائم کی جوب مل گئی۔

وہ مستعدی سے کام کرنے لگا مگر ایک دن یہ معمولی سی ملازمت بھی خطرے میں پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی کیوں کہ فرم کا ایک حصہ دار اپنا سارا حصہ لے کر الگ ہو گیا تھا۔

مجھے ضرور جواب مل جائے گا۔ اس نے سوچا اور اس کی سوچ نصف صحیح ثابت ہوئی کیونکہ اس کی تنخواہ آدھی کر دی گئی۔

اس تنخواہ سے گھر کے اخراجات کیونکر پورے ہو سکیں گے۔ یہ خیال اُس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔

اس روز وہ اپنی فرم میں کام سے فارغ ہو کر واپس گھر جا رہا تھا کہ اُس کی نظر عبدالقادر پر پڑ گئی۔ یکایک ایک خیال ایک کرن کی طرح اس کے ذہن میں چمک اٹھا۔

وہ بے اختیار ہو کر اُس کی طرف بڑھا۔

"السلام علیکم جناب — آپ عبدالقادر ہیں نا؟"

عبدالقادر نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور آپ داؤد ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"فرمائیے۔"

عبدالقادر کے سوال پر وہ بولا۔

"اگر آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو آئیے قریبی ریستوران میں چند لمحے گزار لیں۔"

عبدالقادر کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دونوں ایک قریبی ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے۔

کچھ رسمی باتوں کے بعد داؤد نے اپنی دکھ بھری روداد سنائی اور بے روزگاری کا خاص ذکر کیا۔

"داؤد صاحب میں بھی اسی بے روزگاری کا ستایا ہوا تھا کہ پستی میں اتر کر اپنا خون بیچنے لگا۔ ایک بیوی۔ دو بچے — کیا کرتا۔"

داؤد نے دو تین لمحے خاموش رہ کر اس کے چہرے کو تکا اور پھر آنکھیں جھکا کر بولا۔

"کیا میں بھی —؟"

"آپ — ایسا کریں گے؟"

داؤد میں قوتِ گویائی شاید ختم ہو گئی تھی یا اس نے یوں محسوس کیا تھا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ سر ہلا کر خالی پیالی ہونٹوں سے لگانے لگا۔

دونوں خاموش تھے — دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

بیرا آیا۔ داؤد نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر پرچ پر رکھ دیا۔ بیرا پرچ لے کر چلا گیا۔

"میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں کیوں کہ اپنی مجبوری سمجھ چکا تھا۔ اس کے لیے آپ کو بلڈ بینک کے انچارج شفیق سے ملنا ہو گا۔"

"وہ کیوں؟"

داؤد ہنس پڑا۔

"حضرت کیس تمھیں کون دے گا۔ اسی نے تو آپ کو میرے ہاں بھیجا تھا ورنہ آپ نے کبھی میرا نام بھی نہیں سنا ہوگا اور ایک بات اور۔۔۔ ہر کیس پر انچارج صاحب کو خون کا کمیشن دینا ہوگا۔"

"کتنی کمیشن۔"

"ہر کیس پر پچھتر روپے۔"

داؤد سوچ میں پڑ گیا۔

"مجھے جلدی پہنچنا ہے، ایک کیس کی توقع ہے۔" عبدالقادر اٹھ بیٹھا۔

وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

"منظور ہے۔ آپ مہربانی کرکے ان سے بات کرلیں۔"

"یوں نہیں ہو سکتا۔ میں کیسے بات کر سکتا ہوں۔" عبدالقادر کہنے لگا۔ "معاملہ آپ کا ہے۔ آپ خود ان سے کہیں گے۔ کمیشن دینے کی حامی بھریں گے اپنا پتا نوٹ کروائیں گے۔ البتہ میں آپ کے ساتھ ان کے پاس چلا چلوں گا۔"

بات طے ہوگئی۔

دوسرے روز بلڈ بینک کے انچارج سے گفتگو کرکے اور اپنا پتا لکھوا کر واپس گھر آیا تو اس کے چہرے پر زندگی کی رونق دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے داؤد۔ خوش معلوم ہوتے ہو؟" اس کی باجی نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں میں خوش ہوں۔ آمدنی کی صورت نکل آئی ہے۔"

"سچ؟ ۔شکر ہے اللہ کا۔ وہ اپنے بندوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔"

اور داؤد نے جلدی سے منہ پھیر لیا کیوں کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اُس کے ہاتھ

وہ نہ جانے کتنی دیر سے چپ چاپ، گُم صُم، سر جھکائے کمرے کے آخری سرے پر بیٹھا تھا۔ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کس ماحول میں ہے، کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور جب اُس کے ذہن میں ایک چھبن سی ہوئی، تو اُس نے بے اختیاری کے عالم میں اوپر سر اٹھایا اور ایک دم اسے احساس ہوا جیسے زندگی چلتے چلتے رک گئی ہے اور وہ ایک ویرانے میں سانس لے رہا ہے۔ چاروں طرف ایک گہرا، ناقابلِ فہم و دل گرفتہ سناٹا چھایا ہے۔

کئی لمحے وقت کے سمندر میں کوئی سرسراہٹ کئے بغیر بیت گئے۔

پھر اُس نے محسوس کیا کہ ایک اُلجھی سی روشنی اُس کی آنکھوں پر دستک دے رہی ہے۔

یہ اس کی بیوی کی نظر تھی جو اس سے کچھ دور اپنی چارپائی کے پاس چینی کے ایک پیالے میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھی۔

وہ اُسے برابر دیکھے جا رہی تھی۔

"زاہدہ آمنہ کا نسخہ پیالے میں سے نکال رہی ہے۔ وہ ڈاکٹروں کے نسخے اِسی پیالے میں رکھتی ہے۔" اُس کے منجمد ذہن میں ایک گرم رو سرایت کر گئی۔

"آمنہ کے بابا!"

یہ آواز وہ گزشتہ تیس برس سے سُن رہا تھا۔ یہ آواز کبھی اس کے سینے میں ایک روشن کرن کی طرح جگمگا جاتی تھی مگر اب یوں لگتی تھی جیسے ایک سوکھا پتہ شاخ سے ٹوٹ کر ایک

مدھم سی چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا ہو۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی ۔ کیا؟ یہ وہ خوب جانتا تھا ۔ یہی کہ آمنہ کی دوا ختم ہو گئی ہے اور یہ لفظ کہتے ہوئے ایک تہہ کیا ہُوا کاغذ اُس کی طرف بڑھا دے گی،

اُس نے نسخہ پکڑ لیا تھا۔

وہ ابھی تک کھڑی تھی ۔ خاموش، مبہوت سی ۔ اس نے خیال کیا کہ وہ اُس سناٹے ہی کا ایک حصہ ہے جو اُس کے چاروں طرف چھایا ہُوا ہے ۔

وہ اُس کی نظروں کی تاب نہ لا کر نیچے دری پر دیکھنے لگا تھا ۔

"آمنہ کے ابا"

"ہوں ۔ دوا ختم ہو گئی ہے ۔ لا کے دیتا ہوں"

وہ سر جھکائے اُس کے قریب کھڑی تھی ۔

اُس نے اُس حمیدہ ، نحیف و نزار پیکر کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا ۔ وہ جب بھی اُس کی طرف دیکھتا تھا ایک سوال اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں تڑپ کر اُسے ضرب لگا جاتا تھا ۔

"کیا یہ وہی زاہدہ ہے جس کی آنکھیں صبح کی اوس کی طرح چمکتی رہتی تھیں ۔ جس کے سیاہ گھنیرے ، شاداب بال بادل کی مانند اس کی آنکھوں تلے پھیل جاتے تھے ۔ اس عورت نے اس کے ساتھ، اِس کے گھر میں تنتالیس برس بتائے تھے ، چھ اولادیں دی تھیں جن میں سے صرف آمنہ زندہ تھی باقی سارے بچے ایک ایک کر کے مر گئے تھے اور اب آمنہ ؟

اُس نے کمرے کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ کے اوپر بکھرے ہوئے سبز رنگ کے کمبل کو دیکھا ۔

اِس کمبل کے نیچے ان دونوں کی اُمیدوں کا چراغ جھلملا رہا تھا ۔

یہ کمبل دیکھتے ہی اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا ۔

زاہدہ اُسے دیکھے جا رہی تھی ۔

اُسے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کہے گی جو پاگلانہ سی ہوگی۔ ہر بار یہ بات سن کر وہ بڑے صبر و تحمل کا ثبوت دیتا تھا۔

"رات میں نے اپنی امی کو خواب میں دیکھا تھا۔"

پھر وہی پاگلانہ سی بات۔

"سُن رہے ہیں؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نہیں جانتی وہ کون سی جگہ تھی — پر وہ میری ہی امی تھیں اور — اُن کے ساتھ ایک بچہ تھا۔"

"بچہ — ؟ کون بچہ؟"

اُس وقت اُس کی نظریں خلا میں گم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میں نہیں جانتی — وہ تھی — میری امی اور وہ بچہ — دونوں ایک ساتھ قدم اٹھا رہے تھے اور پھر اُن کے اردگرد پھول ہی پھول نظر آنے لگے۔ دونوں پھولوں میں غائب ہو گئے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس عورت کو یہ کیسا وہم ہو گیا ہے کہ ایک بچہ دعا کرے گا تو اس کی بیٹی تندرست ہو جائے گی جیسے وہ خود صحت یاب ہو گئی تھی۔

"تمھیں خبر ہے ناشادی سے پہلے میری حالت کتنی نازک ہو گئی تھی۔ امی نے ایک بچے سے کہا "بیٹا! باجی کی صحت کے لیے دعا کرو میں دیکھ رہی تھی کہ بچے نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے۔ امی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور اُن کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اور پھر۔"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"میری ماں تو آمنہ کے گئی نا۔ تم بھی۔ سنا آمنہ کے ابا جی؟"

"پاگل ہے یہ عورت"۔ اُس نے دل میں کہا۔

وہ نسخہ ہاتھ میں لیے اُٹھ بیٹھا۔

"جا رہے ہو۔ اچھا۔ تم بھی کر دیکھو۔ کوشش تو کرو۔ پورے یقین کے ساتھ۔ میری بچی بچ جائے گی۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جو وہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

دروازے سے کچھ دُور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی بیوی دروازے پکڑی تھی اور دوپٹہ جو بے خیالی میں نیچے آ گیا تھا، دونوں ہاتھوں سے سر پہ پھیلا رہی تھی کیتی ملتجیانہ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ رک گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کلینک سامنے دکھائی دے رہا تھا۔

کلینک بند تھا۔

اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ کلینک صبح نو سے ایک بجے اور بعض اوقات دو بجے تک کھلا ہوتا تھا۔ گیارہ بجے کیسے بند ہو گیا؟

کلینک کے دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس پہ لکھا تھا "ڈاکٹر صاحب جمعرات کو کلینک کھولیں گے۔"

جمعرات؟۔ آج تو منگل ہے۔ دو دن کلینک بند رہے گا۔

کلینک کے سامنے کھڑا ہو نا بے کار تھا۔ تو وہ کدھر جائے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا مگر وہ چلا جا رہا تھا۔ اور ہر قدم اسے گھر سے دور کئے جا رہا تھا۔

نڈھال ہو کر وہ باغ کے باہر ایک باغیچے پر بیٹھ گیا۔ لوگ آ رہے تھے، لوگ جا رہے تھے۔ خوش و خرم چہرے، آرزو کی حرارت سے تمتماتے چہرے، افسردہ چہرے، مایوس چہرے، نہ جانے ان میں سے کتنوں کے دلوں میں اپنے عزیزوں، اپنے پیاروں، اپنے بچوں کی بیماری کا خیال سلگ رہا ہو گا۔ کتنے اس خیال سے فکرمند ہوں گے کہ جب وہ گھر میں جائیں گے تو ان کی بچی مسکرا کر ان کا استقبال کرے گی یا سبز رنگ کے بوجھل کمبل تلے چھپی ہو گی۔

یکایک۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے پہلو سے کوئی شے مس کرنے لگی ہے۔

اس نے سر دائیں جانب گھما دیا۔ یہ ایک بچہ تھا جو اپنا بستہ گردن میں ڈالے اُس کے پہلو میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارشد بیٹا ان صاحب کو کیوں تنگ کرتے ہو۔" یہ ایک نسوانی آواز تھی۔

"معاف کیجئے جناب! یہ بڑا شریر بچہ ہے۔"

یقیناً وہ اس شریر لڑکے کی ماں ہی تھی۔ اس نے بیٹے کی ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹی اور بیٹا بڑی طرح ہنستا ہوا اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ بنچ پر بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا۔

"آمنہ بھی ایک روز اسی طرح میرے پہلو میں چھپ گئی تھی اور زاہدہ نے اسی طرح اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تھے۔"

وہ اُٹھ بیٹھا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

یہ ایک دوائی خانہ تھا اور وہ اس کے اندر جا رہا تھا۔

اس نے چاہا کہ دوائی کا نسخہ بنوالے اور جب اِس مقصد کی خاطر اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں کوئی کاغذ نہیں تھا۔ اس نے یہی ہاتھ دوسری جیب میں ڈالا۔ وہاں صرف نقدی تھی۔

"نسخہ کہاں گیا؟"

وہ وحشت زدہ سا باغ والے بنچ کے پاس پہنچا۔ اس کی نظریں نسخہ تلاش کرتی رہیں گھاس اور پتوں کے ڈھیروں پر نسخہ نظر نہ آیا۔

"میں نے نسخہ گم کر دیا ہے۔"

اُسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا اور وہ چکرا کر گھاس کے اوپر بیٹھ گیا۔

بچے اپنے اپنے بستے سنبھالے ہنستے کھیلتے کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی بھاگتے ہوئے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دو چار دوکان داروں سے چیزیں خرید رہے تھے۔

وہ چند لمحوں کے لیے اپنی بیماری بھول گیا اور دلچسپی سے اُن بچوں کو دیکھنے لگا۔

"بچہ ایک آسمانی مخلوق ہے جو زندگی کے آنگن میں خوشیاں پھیلانے کے لئے آتا ہے۔"

یہ فقرہ اس نے نہ جانے کس جگہ پڑھا تھا اور اس موقعے پر اسے بے اختیار یاد آ گیا تھا۔

موسم کچھ تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دھوپ کسی قدر پھیکی پڑ گئی تھی۔ ایک بڑی عمر کی عورت ایک بچے کی انگلی پکڑے اس کے پاس سے گزری اور اوپر دیکھ کر جلدی جلدی چلنے لگی۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گھر سے دور دونوں بھیگ جائیں۔

کوئی خیال، کوئی ارادہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ بلا کسی مقصد کے چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک مکان کے دروازے پر رک گیا۔

دروازے پر دستک۔

"کون ہے؟"

"میں۔"

"آ جائیے۔"

ایک عورت نے اس کا خیر مقدم کیا۔

"بھائی جان! آج راستہ کیسے بھول پڑے؟"

"ہاں تمہارے ہاں کافی لمبی مدت کے بعد آیا ہوں۔ سب خیریت ہے نا۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ کہئے۔ سنا تھا آمنہ بیمار ہے۔"

"پریشان کر دیا ہے اس کی بیماری نے۔ اس کی دوا لینے نکلا تھا۔"

وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"اب تو محمود پانچ برس کا ہو گا۔ دکھائی نہیں دے رہا۔" یہ بات کہتے ہوئے وہ کچھ گھبرا گیا تھا۔

عورت نے آہ بھری۔

"یہی تو مصیبت ہے بھائی جان! عزیزوں کے دکھ سکھ کا علم ہی نہیں ہوتا۔ میرا محمود پچھلے سال چل بسا

تھا۔ اچانک موت ہوئی اور۔۔۔"

"ہمیں خبر ہی نہ ہو سکی۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں بھائی جان! عزیزوں کو۔" اور اُس نے وہی فقرہ دہرا دیا۔

عورت بتا رہی تھی کہ صبح کے وقت کیسا خوش خوش پلنگ سے اٹھا، کس خوشی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرنے لگا۔ ابھی ناشتا کیا ہی نہیں تھا کہ کہنے لگا امی پیٹ میں درد ہے۔ باپ نے کیمسٹ سے دوا لا کر دی۔ دوا کھا بھی نہ سکا۔

وہ چپ چاپ سنے جا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور اپنی عزیزہ کے روکنے کے باوجود دروازے سے نکل آیا۔

اب وہ ایک دروازے پر کھڑا تھا۔

"ارشد صاحب! آئیے۔ اندر آئیے۔" اس کے ایک ہم عمر شخص نے اس کا استقبال کیا۔

کمرہ کئی عورتوں اور کئی مردوں سے بھرا ہوا تھا۔

"بڑے اچھے موقعے پر آئے ہیں آپ ارشد صاحب آج ہمارے خالد کی چھٹی سالگرہ ہے۔" خالد کی ماں نے کہا۔

"کہاں ہے خالد؟" اُس نے پوچھا۔

"دوسرے کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ۔"

وہ اُٹھ بیٹھا۔ "خالی ہاتھ آنا مناسب نہیں تھا۔"

کئی آوازیں اُسے بیٹھنے پر اصرار کرنے لگیں مگر وہ رُک نہ سکا۔

اب چلتے ہوئے اُس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ فضا میں دھوپ کافی حد تک پھیل چکی تھی۔

وہ پھر ایک باغ کے باہر جا رہا تھا، ایک بنچ دیکھتے ہی اس کے قدم اُس طرف اٹھنے لگے۔

وہ بنچ پر جیسے گر پڑا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پانی کا ایک قطرہ اس کی پیشانی پر گرا اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

ایک بڑا پیارا بچہ اس کے قریب بیٹھا تھا اور مُسکرا مُسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

یہ بچہ اُسے بہت ہی پیارا لگا اور عین ان لمحوں میں اس کی بیوی کا چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ جو بزبانِ خاموشی کہہ رہا تھا۔

"یہی وہ بچہ ہے جو ہماری آمنہ کے لیے دعا کرے گا۔"

وہ بچے کے اور قریب چلا گیا۔ اور بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے سر پہ پھیرنے لگا۔

ایک شخص بنچ کے پاس کھڑا بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

یہ شخص ابھی ابھی کہیں سے آیا ہے اور یقیناً اس بچے کا باپ ہے۔ اُس نے دل میں کہا۔

"معاف کیجیے۔ یہ بچہ آپ کا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ میرا ہی بچہ ہے۔ فرمائیے۔"

"کیا کہوں، یہ میری بیوی کی خواہش ہے۔ دراصل یہ اس کا ذاتی اعتقاد ہے۔"

"کیا ہے؟"

"وہ چاہتی ہیں کہ کوئی بچہ ہماری بیمار لڑکی کی شفایابی کے لیے دعا کرے۔ میں آپ کے بچے سے دعا کروانا چاہتا ہوں۔"

"کیسے؟"

"جی یوں۔" اور اس نے بچے کے ہاتھوں کو پھیلا کر انھیں ایک دوسرے سے ملا دیا۔

"کہو پیارے بچے اے اللہ آمنہ کو شفا دے دے۔" اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

بچہ خاموش تھا اور بڑی حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"صاحب! یہ دعا کیسے کرے گا۔ بے چارا گونگا، بہرا ہے۔"

وہ اسی لمحے اُٹھ بیٹھا۔ اجنبی اُس سے کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ سن سکا اور چلنے لگا۔

کئی بازاروں، کئی سڑکوں سے گزر گیا۔ اُس کے پاؤں بڑے بوجھل ہو گئے تھے لیکن وہ چلتا جا رہا تھا۔

تیز بارش ہونے لگی۔ اور اندھیرا چھا گیا۔ کسی چیز سے ٹکرا کر وہ رکنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے دل میں اپنی مرنے والی اولاد کا غم تازہ ہو گیا، بیوی کی التجا یاد آ گئی، دن بھر کے تینوں ناکام تجربات کا خیال آ گیا اور اسے محسوس ہوا کہ ایک غار کے دہانے پر کھڑا ہے اور بادلوں کے پرے کے پرے اس کے اندر بڑی تیزی سے اترتے چلے جا رہے ہیں۔

بارش برس کر تھم سی گئی۔ مدھم روشنی ہونے لگی۔

وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اور شاخوں سے پانی کے موٹے موٹے قطرے گر گر کر اُس کے بکھرے ہوئے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

ایک بار پھر اُسے دن بھر کے تجربات یاد آنے لگے۔ اُسے محسوس ہونے لگا جیسے آخری بچے کے ہاتھ دعا کے لیے پھیلا رہا ہے۔ اور اُسی لمحے اس کے باپ کے الفاظ اس کے اندر ایک تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو گئے۔

"صاحب! یہ دعا کیسے کرے گا۔ بے چارا گونگا بہرا ہے۔"

درد کی ایک لہر اٹھی اور اس کے سارے جسم میں پھیل گئی۔ اُس کی آنکھوں میں دُکھ کی ایک گہری کیفیت آنسوؤں میں بہنے لگی اس کے ہونٹوں پر تھرتھراہٹ آئی۔ اس کے ہاتھ اوپر اُٹھے اور اس کے کانوں میں اپنے ہی آنسوؤں سے بوجھل آواز رینگنے لگی "اے اللہ آمنہ کو شفا دے۔" اور اسی لمحے جیسے روشنی ایک دم بڑھ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور یک لخت اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ ڈر گیا۔ خوف زدہ ہو گیا۔

یہ اس کے ہاتھ نہیں تھے۔ ایک بچے کے ننھے ننھے ہاتھ تھے۔

وہ سخت گھبراہٹ اور حیرت میں بھاگنے لگا۔ اور پھر اُسے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

اب اس نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ ماحول اسے مانوس معلوم ہُوا۔ اس کی بیوی اس پر جھکی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا تھا — آپ سڑک پر گر گئے تھے۔ لوگوں نے پہچان کر یہاں پہنچا دیا۔"

"آمنہ!" اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

"آمنہ کو اللہ نے خطرے سے نکال دیا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ نے کسی نیچے سے ضرور دعا کروائی ہے — کس نیچے سے؟" وہ بے اختیار اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا اور اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"یہ میرے ہاتھ ہیں؟"

"ہاں ہاں — کیا ہوا —"

"میرے ہاتھ ہیں — سچ مچ؟"

اس کی بیوی حیران ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی — وہ لگاتار اپنے ہاتھوں کو دیکھے جا رہا تھا۔

سڑک پر

وہ سڑک شہر کے پُر رونق بازاروں میں سے نہیں تھی۔

صبح اور شام کے وقت بھی، جب بڑی سڑکوں پر آنے جانے والوں اور ٹریفک میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے، لوگوں کی کچھ زیادہ آمد و رفت نہیں ہوتی تھی۔ دوپہریں تو قریب قریب سنسان ہی گزرتی تھیں۔

ایک روز صبح سویرے ہی جب سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا، حاجی عابد علی اور بنوا اڑی جمال خاں کی دکانوں کے سامنے کافی خلقت جمع ہو گئی تھی اور جو بھی ادھر سے گزرتا تھا "کیا ہوا ہے؟" کا خاموش سوال بن کر بے اختیار رک جاتا تھا۔

اس ہجوم کی وجہ یہ تھی کہ ان دکانوں کے سامنے دو اڑھائی گز کے فاصلے پر خون میں تر بتر ایک شخص پڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایکسیڈنٹ میں بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔

زخمی حاجی صاحب اور جمال خاں کی دکانوں کے آگے پڑا نظر آ رہا تھا اس لیے ہر نو وارد زخمی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انہی سے پوچھتا تھا۔

"ایکسیڈنٹ کب ہوا؟"

حاجی صاحب جواب دیتے۔

"میں نے دکان کھولی تو یہ ہو چکا تھا۔"

جمال خاں منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ حاجی صاحب کی تائید میں سر ہلا دیتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی دکان بھی ایکسیڈنٹ کے بعد کھلی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے مجمع میں ہر شخص مضطرب اور بے قرار تھا۔ نئے آنے والے ایکسیڈنٹ کے متعلق پوچھتے تھے اور غیر تسلی بخش جواب سُن کر زیادہ مضطرب ہو جاتے تھے۔

ایک بزرگ آیا۔ اُس نے زخمی کے پاس کھڑے ہو کر آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں اور بڑے خضوع و خشوع سے کہا:

"مولا کریم اپنے عاجز بندوں پر رحم کر۔"

ایک نوجوان نے زخمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے اور جب اُسے اُن آنکھوں میں زندگی کی رمق محسوس ہوئی تو غصے سے بولا:

"تم لوگوں نے مجرم کو پکڑا کیوں نہیں۔ جانے کیوں دیا؟"

مجمع سے کئی آوازیں اُٹھیں۔

"ہم نے نہیں دیکھا۔"

نوجوان کا چہرہ فرطِ غضب سے سرخ ہو گیا۔ سارے مجمع کی مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں۔

ایک بڑھیا زخمی پر جھک گئی۔

"ہوگا کسی ماں کا لال۔ ہائے وے میرے ربّا!" اور بڑھیا نے زور سے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا اور آنسو بھری آنکھوں سے حاجی صاحب کو دیکھ کر بولی۔

"منہ میں پانی ڈالتے۔"

یہ لفظ سنتے ہی سب کو یوں محسوس ہوا جیسے انہوں نے ایک ضروری فرض تو ادا ہی نہیں کیا۔

"پانی لاؤ۔" آوازیں اُبھریں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹا سا لڑکا پانی سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس لے آیا۔

حاجی صاحب نے گلاس لے لیا۔ جمال خاں نے زخمی کا سر اپنے ہاتھوں سے ذرا اوپر اٹھایا۔ قریب کھڑے ہوئے لوگ جھک کر یہ منظر دیکھنے لگے۔

پانی منہ کے اندر جانے کی بجائے اس کی ٹھوڑی پہ بہنے لگا۔

"میں کہتا ہوں وہ حرامزادہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

سب کی نظریں اُس منظر سے ہٹ کر اس نوجوان کا احاطہ کرنے لگیں جو اپنی موٹر سائیکل سے اتر کر زخمی کو دیکھنے لگا تھا۔

"غضب خدا کا دن دہاڑے یہ ظلم۔"

یہ فقرہ اُسی بڑھیا کا تھا جو اپنے سینے پہ دو ہتڑ مار چکی تھی۔

"اس بدمعاش کو پکڑا کیوں نہیں؟" نوجوان نے سوال کیا۔

"پتا نہیں کون تھا؟" کسی نے اپنی طرف سے جواب دینے کی کوشش کی۔

"پکڑ کر قیمہ کر دیا ہوتا۔"

ایک نوجوان نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی۔

"پتا نہیں کون تھا۔ کہاں پہنچ گیا ہوگا۔" ایک باریش بزرگ نے کہا۔

"اُسی وقت بھاگنا چاہیے تھا اُس کے پیچھے۔" کسی کی آواز آئی۔

"ظلم ہے کہ نہیں حرامی ظلم کر کے چلا گیا اور سب کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔"

نوجوان جو بزرگ کی بات سن کر ٹھہر گیا تھا بڑے غصے سے بولا۔

"ہم پر الزام نہ دو تھے ہی نہیں یہاں۔" ایک شخص نے اپنی صفائی پیش کی۔

"یہاں ہوتے تو اُسے جانے دیتے۔ زندہ چھوڑتے بھلا؟" صفائی پیش کرنے والے نے مزید کہا۔

"تم جاؤ۔" آوازیں آئیں۔ تُم سے مُراد موٹر سائیکل والے سے تھی۔

موٹر جلد ہی نظروں سے غائب ہوگئی۔

حاجی صاحب نے ابھی تک گلاس ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

"یارو! اس کا کچھ کرو۔" ایک خشخشی داڑھی والے نوجوان نے زخمی کو دیکھ کر کہا۔

"روکو کسی کو۔" کسی نے کہا۔

ایک نیلے رنگ کی کار جا رہی تھی۔ سب کے ہاتھ اُسے روکنے کے لیے بلند ہوگئے۔

کار رُک گئی۔

کار کے اندر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔

"دیکھا نہیں ادھر، خون میں تر زخمی پڑا ہے۔" نوجوان عورت نے شوہر کے شانے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تو۔ تو۔" شوہر بُری طرح گھبرا گیا تھا۔

"کل ہی گدیاں بدلوائی ہیں۔ تباہ ہو جائیں گی۔ اُس کے خون سے۔" عورت نے پریشان لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ کوئی کار کے قریب جاتے۔ کار روانہ ہو چکی تھی۔

"ذلیل کتا۔" نوجوان نے کار کو جاتے ہوئے دیکھ کر کہا اور زور سے تھوک دیا۔

"دنیا بدل چکی ہے۔ آہ۔ ہا۔" بزرگ نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کسی کو بھی اپنی موت یاد نہیں۔" بزرگ نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

"کوئی جائے گاڑی تانگہ کرآئے۔" خشخشی داڑھی والے نے کہا۔

"خود ہی چلے جاؤ یار۔"

"ہے سائیکل کسی کے پاس۔"

خشخشی داڑھی والا سائیکل کا انتظار کرنے لگا۔ کسی نے سائیکل عنایت کی اور وہ پیدل چل پڑا۔

"ہوا بہت ہی بُرا۔" کوئی بولا۔

"بہت بُرا بھائی۔ بہت ہی بُرا۔" حاجی صاحب نے تائید کی۔

"ہائے اللہ اس کے بیوی بچے بھی ہوں گے۔" بڑھیا نے پھر سینے پہ دو ہتڑ مارتے ہوئے کہا۔

"ہوں گے۔ اُن بے چاروں کو کیا خبر کہ یہاں۔"

بزرگ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں آنکھوں کے نیچے گالوں پہ پھیرنے لگا۔

"غضب خدا کا ذرا ٹھہرا بھی نہیں ظلم کر کے۔"

بزرگ کے فقرے سے لوگوں پہ قدرے رقت طاری ہو گئی تھی مگر سب کسی نے یہ لفظ کہے تو۔

کیفیت ختم ہو کر اضطراب اور بے چینی میں ڈوب گئی۔

"وہ مجرم کو پکڑے گا۔"

"ایک دفعہ آ تو جائے ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔" کسی نے سب کے شعلہ ناک جذبے کی ترجمانی کی۔

"ہاتھ آ تو جائے ایک بار۔" ایک شخص دانت پیس کر بولا۔

یکایک ایک لڑکا بھاگا بھاگا آیا۔

"کیا ہوا؟" یہ سوال سب کے چہروں پر ایک لکیر سی بن کر پھیل گیا۔

"طفیل ۔ جا رہا تھا ۔ بھاگا بھاگا جا رہا تھا۔"

"مجرم کے پیچھے؟" سب نے یک آواز پوچھا۔

لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سب کے چہرے تمتما اٹھے۔

چند لمحوں بعد ایک اور لڑکا آ گیا۔ بری طرح پریشان تھا۔ لگتا تھا کوئی بہت اہم خبر سنانے والا ہے

مگر زبان یاوری نہیں کر رہی۔ سب نے اسے گھیرے میں لے لیا۔

"طفیل ایک ٹیکسی والے سے لڑ رہا تھا۔" لڑکے نے بمشکل کہا۔

"وہ مجرم ہو گا۔" کسی نے کہا۔

"وہی مجرم ہو گا۔" آوازیں ابھریں۔

"مجرم پکڑا گیا ہے۔" سب کی مٹھیاں ایک بار پھر بھنچ گئیں۔

سب کے سب سانس روک کر ادھر دیکھ رہے تھے جدھر سے لڑکا آیا تھا۔

چند لوگ غیر ارادی طور پر ادھر قدم اٹھانے لگے تھے۔

ایک ٹیکسی آ رہی تھی۔

"پکڑ لو کمینے کو۔"

"پولیس کے حوالے کر دو۔"

"قیمہ کر دو۔"

آوازیں بلند ہوگئیں۔

ٹیکسی پوری طرح رک چکی تھی۔ ہر ایک بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولے بغیر ڈرائیور کو دروازے میں سے نکال کر کئی ہاتھ گھونسے بن کر اس پر برسنے لگے۔ کئی ٹانگیں اُسے فٹ بال بنانے لگیں اُس کے منہ سے لفظ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکل رہے تھے مگر کوئی بھی اس کی آواز سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہر ایک اس کی ہڈی پسلی ایک کرنے پر تلا ہوا تھا اور طفیل اندر بری طرح چیخ رہا تھا۔ شیشے پر زور زور سے مکے مار رہا تھا۔

سب ڈرائیور کی پٹائی میں مصروف تھے کسی نے بھی اس کی حرکت نہ دیکھی۔

وہ شیشہ توڑ کر باہر آگیا۔

"خدا کے لیے نہ مارو۔"

طفیل نے اپنے زخمی ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو۔۔ میں بڑی مشکل۔۔ سے۔۔ زخمی کر۔۔ ہسپتال۔"

"کیا؟" آوازیں ابھریں۔

"ہسپتال۔۔ لے جانے کے لیے لا رہا تھا۔"

ڈرائیور پر برستے ہوئے مکے رک گئے۔ وہ بری طرح زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی روشنی دو خون آلود انسانی جسموں پر پڑ رہی تھی اور لوگ جلدی جلدی کھسکتے جا رہے تھے۔ حاجی صاحب اور جمال خاں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی دکانیں بند کر رہے تھے۔

چند لمحوں بعد سڑک پر صرف دو خون آلود جسم رہ گئے۔

اُصول کی خاطر!

فرخندہ نے تیسری بار سامنے دیوار پہ کلاک کو دیکھا اور بڑبڑائی "سوا چھ بج گئے- اُف میرے اللہ"

جلال کو چار بجے چھٹی ہو جاتی تھی- زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ راستے میں صرف ہو جاتا تھا- ساڑھے

چار بجے تک وہ گھر کی کال بیل پر انگلی رکھ دیتا تھا اور فرخندہ جو اِس آواز کی منتظر ہی ہوتی تھی فوراً آرام کرسی

سے اُٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑتی تھی مگر اُس شام تو سوا چھ بج گئے تھے اور ابھی تک کال بیل نے

اُس کی آمد کی خبر نہیں دی تھی-

بے اختیاری کے عالم میں وہ دروازے پہ گئی- ایک پٹ کھولا اور جھک کر باہر دیکھنے لگی-

گلی میں لوگ آ جا رہے تھے مگر اِن میں جلال نہیں تھا-

اس نے ایک منٹ کے بعد دروازہ بند کر دیا- واپس آ کر کرسی میں گر پڑی-

کلاک میں دو منٹ اُوپر ہو چکے تھے-

وہ کچھ زیادہ مضطرب ہو گئی- یکایک کال بیل نے اطلاع دے دی کہ دروازے پر کوئی

آ گیا ہے-

اس نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا- جلال آ چکا تھا-

"اتنی دیر؟"

"ہاں فرخو! کچھ دیر ہو گئی- وہاں چلا گیا تھا"

"وہاں کہاں؟"

جلال نے اُس کے اِس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اندر آیا۔ اپنے تھیلے کو، جو سالہا سال سے اس کا ساتھ دے رہا تھا، کرسی کے بازو سے لٹکایا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

فرخندہ معمول کے مطابق چائے تیار کرنے کی خاطر باورچی خانے کی طرف جانے لگی مگر جاتے جاتے ایک دم رُک گئی۔

"بتایا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔"

جلال نے اُسے واپس آنے کا اشارہ کیا اور وہ تذبذب کی حالت میں وہیں کھڑی ہو گئی۔

"آج چائے نہیں چلے گی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔"

وہ کرسی میں بیٹھ گئی۔

"میں نے بس یونہی اُسے فون کر دیا۔ ارشد کو۔"

"اپنے بھتیجے کو؟" فرخندہ کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ اِس خبر سے اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی

"سنو تو۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ اس کا خون سفید ہو گیا ہے۔ اپنے غریب رشتہ داروں کی اسے کیا پروا ہو گی مگر فرخو جب میں نے اسے بتایا کہ میں جلال بول رہا ہوں تو کہنے لگا "کہئے انکل! کیسی طبیعت ہے آپ کی، گھر میں خیریت ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"کام کی بات نہیں کی؟" فرخندہ نے بیتابی سے پوچھا۔

"کی کیوں نہیں۔ آخر اسے فون کرنے کا مقصد کیا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو کہنے لگا "انکل! جب آپ دفتر سے نکلیں تو یہاں آ جائیں۔ میں دیر تک اپنی فرم میں بیٹھتا ہوں اور اس نے اپنی فرم کا پورا پتا بتا دیا۔"

"تو گئے وہاں؟"

"ضرور گیا۔ فرخو! اتنا شاندار دفتر ہے کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا، کرسی میں بٹھایا، نوکر کو چائے لانے کے لیے کہا اور بڑے ادب احترام سے میری بات سنی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ یہ کہو کچھ کرے گا بھی یا نہیں۔"

"فرخو! آج تم۔ کیا کہوں لگتا ہے تمہارا موڈ اچھا نہیں ہے۔"

"میرے موڈ کے اچھے یا بُرے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہارے اِس دولت مند مغرور بھتیجے نے کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ انکل مر گیا ہے یا زندہ ہے۔ تم نہ جانے کیا اُمید لے کر اُس کے ہاں جیسے گئے تھے۔"

"اُمید یہ لے کر گیا تھا کہ وہ سیدھے منہ بات نہیں کرے گا لیکن اُس کا رویہ میری سوچ کے بالکل برعکس نکلا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں خریدتا ہے اور بیچ دیتا ہے۔ لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ بڑا وسیع کاروبار ہے۔ میری پرابلم سن کر بولا "انکل! آپ مطمئن ہو جائیں۔ اب یہ پرابلم میری ہے آپ کی نہیں۔"

"تو ہمارا مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا؟"

بیوی کے اِس استفسار پر جلال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"فرخو! میں نے اِسے گود میں کھلایا ہے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ایک روز اتنا دولت مند اور بڑا آدمی بن جائے گا۔"

اور تیسرے روز وہ بڑا آدمی جلال کے ہاں چائے پی رہا تھا۔

جلال اسے دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔ مارے خوشی کے چائے کا کپ وہ ہونٹوں کی طرف لے جانا بھول گیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے مقابلے میں فرخندہ اُسے کن انکھیوں سے دیکھ کر چائے کا ایک آدھ گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیتی تھی۔

"آنٹی! آپ ذرا وضاحت سے بتائیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں۔"

فرخندہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اسے اظہار کے لیے شاید مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"ارشد بیٹا! میں نے اپنی پرابلم آپ کو بتا تو دی تھی" جلال نے یہ دیکھ کر کہ اس کی بیوی اظہارِ مطلب میں کچھ ہچکچا رہی ہے ___ یہ الفاظ کہہ دیئے۔

"وہ تو میں سمجھ چکا ہوں۔ مگر آنٹی کی زبانی بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں" ارشد نے ذرا مسکرا کر کہا اور

خالی پیالی میز پر رکھ دی۔

جلال ہنس پڑا۔" گویا آپ کا مطلب ہے کہ میاں بیوی میں اتفاق رائے نہیں ہے؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں تاہم ان کی زبانی بھی معاملے کی وضاحت ہو جانی چاہیے۔"

فرخندہ جو ارشد کے لیے پیالی بنا رہی تھی۔ بولی:

"آپ کے انکل نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ شادی کے بعد بیٹی کے لندن چلے جانے سے ہم دو رہ گئے ہیں۔ بڑا گھر ہے جس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔"

"سمجھ گیا۔" ارشد نے اپنا سر ہلایا۔

"پھر ارشد بیٹا! ہم نے آمنہ کی شادی کے لیے ایک دوست سے ستر ہزار قرض لیا تھا۔" جلال کہنے لگا۔

"ستر ہزار؟" ارشد نے دوسری پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

"جی ہاں۔ وہ دوست اپنا مکان بنانا چاہتا ہے۔ قرض کی رقم واپس کرنا ہوگی۔ تمہاری آنٹی نے اپنا زیور رہن رکھ کر بینک سے دس ہزار لیے تھے جو شادی پر خرچ ہو گئے۔"

"کل اسّی ہزار قرض ہے۔" فرخندہ نے بات اختصار سے کہہ دی۔

"اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔" ارشد چائے کے جلدی جلدی گھونٹ بھر رہا تھا۔" یہ مکان بک جانا چاہیے۔ اور آپ دونوں کے گزارہ لائق ایک چھوٹا مکان خریدنا ہوگا۔ یہی آپ کا مقصد ہے نا؟"

"بالکل۔" جلال نے بے تابی سے جواب دیا۔

"آنٹی! آپ بھی یقیناً یہی چاہتی ہیں؟"

جلال پھر ہنس پڑا۔" ارشد! ہم دونوں میں شاذو نادر ہی کسی معاملے میں اختلاف رائے ہوا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن ہو جائیں۔ اصل میں میں ایک بااصول کاروباری آدمی ہوں۔ کسی صورت بھی اصول سے روگردانی نہیں کرتا۔ آنٹی سے پوچھنا بھی ضروری تھا۔" یہ کہہ کر ارشد نے اپنے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ارشد! پہلی مرتبہ اپنے چچا کی جھونپڑی میں آئے ہو۔ ذرا رک جاؤ۔" جلال کے لہجے میں غیر شعوری طور پر جذبۂ تشکر کے ساتھ ایک ملتجیانہ انداز بھی تھا۔

"آپ اسے جھونپڑی کہتے ہیں۔ واہ انکل۔ شاندار مکان میں رہتے ہیں۔ اور کوئی جائداد؟"

"اور کوئی جائداد؟ کہاں سے آتی۔ کلرک بھرتی ہو کر سپرنٹنڈنٹ کی سیٹ تک پہنچا ہوں۔"

"انکل برا نہ مانیے۔ ابا جی مرحوم اور آپ۔ دونوں نے ترقی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کسی اچھے اصول کو اپنایا نہیں۔ اصول کے بغیر زندگی میں ترقی نہیں ہوتی۔"

"اب بڈھے طوطے کو کیا نصیحت کر رہے ہو۔"

جلال نے کہا اور اس پر ارشد کے علاوہ فرخندہ بھی ہنس پڑی۔

دو ہفتوں کے بعد ارشد نے اپنے انکل اور آنٹی کو اپنے ہاں کھانے پر بلا لیا۔ دونوں ارشد کا وسیع اور خوبصورت بنگلہ اور اس کا قیمتی فرنیچر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ چیزیں انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں مگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ ارشد اور اس کی بیگم اپنے مہمانوں کی اس طرح خاطر داری کر رہے تھے گویا وہ انھیں اپنے معزز اور محترم مہمان سمجھتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب سب کھانے کی میز سے اٹھ کر دوبارہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آ بیٹھے اور چائے کا دور چلنے لگا تو ارشد بولا۔

"انکل! میں نے اپنی طرف سے آپ کی پریشانی دور کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرا منصوبہ پسند نہ آئے مگر میں نے اس میں کوئی کمی آنے نہیں دی۔"

جلال جو اپنے بھتیجے کے احسان تلے دبا جا رہا تھا کہنے لگا۔

"مجھے اس منصوبے کا علم نہیں۔ مگر مجھے مکمل یقین ہے یہ ہمارے لیے بےحد مفید ہو گا۔"

"جی ہاں۔ آپ نے ہماری بہتری ہی سوچی ہے۔" فرخندہ نے اپنے الفاظ سے شوہر کی تائید کی۔

"میں نے انکل! پچھلے دنوں یہی مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا مسئلہ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ بیٹی کے ولایت چلے جانے سے آپ صرف میاں بیوی رہ گئے ہیں۔"

"جی۔" جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ مکان جس میں آپ رہتے ہیں۔ بڑا ہے۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔"

"پھر تو قرض بھی ہے ہم پر۔" جلال نے مزید وضاحت کی۔

"یہ بات بھی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ مکان فروخت کر دیا جائے۔ اس سے جو رقم ملے اس سے ایک گزارہ لائق چھوٹا سا مکان خرید لیا جائے اور قرض کی رقم بھی ادا کر دی جائے۔ کیا میں درست کہتا ہوں؟"

ارشد نے مسکرا کر سوال کیا اور دونوں میاں بیوی بیک آواز بولے۔

"بالکل درست۔"

"تو میری متواتر کوششوں سے ایک صاحب آپ کے مکان کے لیے تین لاکھ بیس ہزار ادا کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ یہ رقم مناسب ہے؟"

جلال نے بیوی کی طرف دیکھا اور بیوی نے شوہر کی طرف۔

"میں سمجھتا ہوں یہ رقم معقول ہے۔ اس سے زیادہ قیمت نہیں مل سکے گی کیوں انکل؟"

"ہاں ہاں۔ بس وہ باتیں ہو جائیں۔"

"وہ باتیں۔ دیکھی سُن لیں۔ میں نے ایک اچھے خاصے مکان کے لیے دو لاکھ بیس ہزار کی آفر دی ہے۔ نیا مکان ہے۔ مالک نے گجرات میں نیا مکان خرید لیا ہے۔"

"اچھا ہے ہمارے لیے؟" فرخندہ نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو ٹھیک ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔ دیکھ لیں آپ خود بھی۔ پسند تو آپ کی ہونی چاہیے نا۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔"

ارشد نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"انکل! خدا کے لیے تکلف نہ کیا کریں۔ میرے ساتھ آپ کا خونی رشتہ ہے۔ خونی رشتے کے

کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ شکریہ کا لفظ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ کر دیتے ہیں؟
جلال بھی شرمندہ ہو گیا۔
"ٹھیک ہے بیٹا! یہ تمہاری برخورداری ہے۔ آج کل کون خونی رشتوں کا خیال کرتا ہے۔"
"میں تو کہتا ہوں انکل!"
"میں نے کہا نا یہ تمہاری برخورداری ہے۔"
تھوڑی دیر بعد جلال اور فرخندہ ارشد کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی ایک نئی آبادی کے ایک مکان کے آگے رک گئی۔
"آئیے انکل! اندر سے بھی آپ کو دکھا دوں۔"
مکان دیکھ کر جلال اور فرخندہ۔ دونوں نے اپنی رضامندی ہی نہیں، خوشی کا بھی اظہار کر دیا۔
دوسرے روز ارشد نے ٹیلی فون پہ جلال کو بتایا۔
"انکل! سارا معاملہ بڑی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔ آج پانچ بجے تک میرے دفتر میں آ جائیں۔"
جلال نے بقیہ وقت دفتر میں بڑی بے تابی سے گذارا۔
اپنے کمرے سے باہر نکل کر سیدھا گھر پہنچا اور بیوی کو یہ خوش خبری سنا دی۔
"کتنا اچھا ہے یہ تمہارا بھتیجا۔ ہم خواہ مخواہ غلط فہمی میں مبتلا رہے۔"
"بیگم! اپنا خون آخر اپنا خون ہی ہوتا ہے۔ آخر اس کے ساتھ ہمارا خونی رشتہ ہے۔ لو اب میں چلتا ہوں۔"
اور جلال جب ارشد کے ہاں پہنچا تو کئی لوگوں کو اپنا منتظر پایا۔
رجسٹرار کے نمائندے کی موجودگی میں دونوں مکانوں کی رجسٹری ہو گئی۔ رقم ادا بھی ہو گئی۔ ایک لاکھ کی گڈی ارشد نے اپنے بریف کیس میں ڈالی اور بریف کیس اپنے انکل کے حوالے کر دیا۔

"لیجیے انکل! فیصلے کے مطابق آپ ایک ماہ اور اپنے مکان میں رہ سکتے ہیں اور جس مکان میں آپ کو جانا ہے وہ ایک ہفتے کے اندر اندر خالی ہو جائے گا۔ آپ کی مرضی جب جی چاہے وہاں چلے جائیں۔"

جلال نے بریف کیس ہاتھ میں لے لیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ صرف ممنونانہ نظروں سے اپنے بھتیجے کو دیکھ سکا۔

"انکل! آپ گھر جائیں۔ میری گاڑی آپ کو چھوڑ آئے گی۔ میں خود چلتا مگر ایک صاحب کو بھی آنا ہے۔ شام کے بعد حاضر ہوں گا۔"

ارشد کی گاڑی جلال کو اس کے گھر پہنچا آئی۔

فرخندہ نے ساری بات سنی تو فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

"جلال! وہ مکان بہت اچھا ہے مگر ہمیں رنگ و روغن کرانا ہوگا۔ سفیدی کرانا ہوگی اور خوب صورت ہو جائے گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر سب سے پہلے وہ ستر ہزار اور دس ہزار کا قرض اتارنا ہوگا۔ کل سب سے پہلے یہی کام کریں گے۔"

"ہاں کچھ فرنیچر بھی نیا خریدیں گے۔"

"منظور۔ بلکہ میری تجویز یہ ہے کہ ڈرائنگ روم کے علاوہ بھی کچھ فرنیچر نیا خریدیں گے۔ میرا خیال ہے جو رقم ہمیں خرچ کرنا ہوگی وہ پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں یہاں سے سامان لے جانے کا بھی خرچ ہوگا۔ ٹھیک سوچا ہے تم نے۔ پانچ ہزار تو ضرور اٹھ جائیں گے۔"

"فرخو!"

"کہو۔"

"تمہاری تجویز میں نے مان لی ہے۔ اب تمہیں میری تجویز ماننا ہوگی۔"

"کیا تجویز ہے تمہاری؟"

"دیکھو فرخو! جب سے ہماری شادی ہوئی ہے ہم ایک بار بھی اپنے شہر سے باہر نہیں جا سکے۔ اب تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ کمیشن پندرہ ہزار کی رقم ہمارے پاس ہے۔ یہ رقم ہم سیر و تفریح میں صرف کریں گے۔"

فرخندہ کا چہرہ کھل اُٹھا۔

"میرے دل کی بات کہہ دی تم نے۔"

"تو طے ہو گیا معاملہ؟"

"بالکل۔"

فرطِ مسرت سے وہ رات کا کھانا بھی نہ کھا سکے۔ ۸ بجے کے قریب ارشد آ گیا۔

دونوں میاں بیوی نے اُس کا دلی شکریہ ادا کیا۔

"شکریے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آخر رشتہ دار کس کام آتے ہیں اور میرا تو آپ کے ساتھ خونی رشتہ ہے۔ ہاں ایک ذرا زحمت کیجیے۔"

"کہو بیٹا!" دونوں بیک وقت بول اُٹھے۔

"وہ — میری کمیشن کے چودہ ہزار دے دیں۔ سارے اخراجات بھی اس رقم میں شامل ہیں۔"

"جی!" دونوں نے بیک آواز کہا۔

"میری کمیشن زیادہ نہیں ہے۔ یہ رقم اصول کی خاطر لے رہا ہوں۔"

جلال ہکا بکا بیٹھا تھا۔ فرخندہ نے بریف کیس خاموشی سے ارشد کی طرف بڑھا دیا۔

ارشد نے بریف کیس میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ نوٹوں کا ایک حصہ میز کے اوپر رکھا۔ باقی گڈی واپس اُس میں رکھ دی۔

"تھینک یو آنکل، آنٹی۔"

اور وہ جانے لگا۔ دروازے پر ٹھہر گیا۔

"انکل! آئندہ جب بھی میری ضرورت پڑے۔ فون کر کے بلا لیں۔ فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے میں سے نکل گیا۔

جلال اور فرخندہ میز کے اوپر نوٹوں کو چند لمحے دیکھتے رہے پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اُن کی نظروں میں ایک ہی سوال اُلجھا ہوا تھا مگر یہ سوال کسی صورت اظہار نہیں پا رہا تھا۔

وہ اور وہ

درآمد و برآمد کی مشہور کمپنی "نیاز اینڈ نواز" کا پرانا ڈائرکٹر اپنی مدتِ ملازمت گزارنے کے بعد دفتر سے جا چکا تھا اور کمپنی کا سارا عملہ اب اپنے نئے باس کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر ایک ماہ کے بعد ایک خوش پوش نوجوان جس کا نام عبدالقادر جعفری تھا، بہ حیثیت نئے ڈائرکٹر کے دفتر میں وارد ہو گیا۔

عملے کے کم و بیش سارے ارکان نے اپنے نئے باس کا خوش دلی سے استقبال کیا مگر ان سب کو پہلے دن ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ نیا ڈائرکٹر پرانے ڈائرکٹر سے کافی حد تک مختلف ہے۔ پرانا ڈائرکٹر باتونی تھا، شاف کے دو تین ممبروں کو اپنے کمرے میں بٹھا کر ان سے خوش گپیاں کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا مگر نیا ڈائرکٹر اپنی شکل سے بڑا سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اپنے پیشرو کے مقابلے میں کم آمیز اور کم گو تھا۔

شاف سے جب اس کا تعارف کرایا گیا تو اس نے صرف مصافحے تک اپنی سرگرمی محدود رکھی، کسی سے بھی کوئی سوال نہ کیا اور فوراً کرسی میں بیٹھ کر فائلوں کے مطالعے میں منہمک ہو گیا۔ دفتر میں کام کرنے والے قدرے مایوس ہو گئے۔ انہوں نے نئے صاحب کے رویے سے اندازہ لگا لیا کہ یہ دفتری معاملات میں سخت گیر ہوں گے اور سختی سے کام لینا پسند کریں گے۔

جعفری نے شروع ہی سے اپنا انداز کچھ اس قسم کا اختیار کیا کہ کسی کو بھی بغیر طلب کئے اس کے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کسی کو کسی دفتری کام کے سلسلے میں بلاتا تھا تو اس سے صرف وہی گفتگو ہوتی تھی جس کی ضرورت ہوتی تھی۔ فالتو فقرہ نہ کہا جاتا تھا اور نہ سنا جاتا تھا۔

چند روز کے اندر اندر ہی دفتر کی فضا میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی۔ دورانِ کار کمروں میں چائے نہیں منگوائی جاتی تھی اور نہ ہی عام طور پر ملاقاتیوں کو عملے کا قیمتی وقت ضائع کرنے کی اجازت تھی۔

پورے عملے نے نئے بوس کی طبیعت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اُسے بہت حد تک یقین ہو گیا تھا کہ اگر کسی نے دفتری اصول و ضوابط سے رُوگردانی کی تو بوس اس کے خلاف ضرور ایکشن لے گا، معاف نہیں کرے گا۔

صبح وقتِ مقررہ پر ڈائرکٹر آتا تھا اور سر جھکائے سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اُسے اُس کا خیال نہیں ہوتا تھا کہ سٹاف پورے کا پورا آ چکا ہے یا نہیں یا سٹاف کا کوئی ممبر اُسے دفتر میں آتے دیکھ کر احتراماً کھڑا نہیں ہوا۔

وہ خاموشی سے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اندر جاتے ہی اس کا سٹینو اکرم شاہ اس کے سامنے پہنچ جاتا تھا۔ ڈائرکٹر کو کچھ لکھوانا ہوتا یا کسی فائل کی ضرورت محسوس کرتا تو یہ کام کروا کر سٹینو کو رخصت کر دیتا۔ بیکار کسی کو اپنے پاس ٹھہرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔

اس روز نو بج کر سات منٹ پر ڈائرکٹر آیا۔ سٹاف کو دو باتوں پہ حیرت ہوئی۔

ایک بات تو یہ کہ وہ نو بجے سے دو چار منٹ پہلے ہی پہنچ جاتا تھا مگر اس روز سات منٹ لیٹ تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ اس کے پیچھے چپڑاسی ایک بڑے خوب صورت پرندے کا پنجرا اٹھائے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے پنجرے کو ایک طرف رکھوا کر چپڑاسی کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس اثنا میں اکرم شاہ کمرے میں آ چکا تھا۔

سٹینو معمول کے مطابق ادب اور احترام سے میز کی ایک طرف کھڑا تھا اور پنجرے کو غور سے دیکھ رہا تھا اور بھول گیا تھا کہ اس کا بوس اس کی اس کارروائی پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

"مسٹر اکرم"

"آپ کو یاد نہیں رہا کہ سوا نو بجے ایک ضروری میٹنگ ہے۔"

"سوری سر۔"

"پچھلی میٹنگ کی فائل لے آئیں۔"

"اکرم تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا اور جب واپس آیا تو اس نے ہاتھ میں فائل پکڑی ہوئی تھی۔

جعفری نے فائل لی اور کمرے سے نکلنے لگا۔

شیلنو پھر پنجرے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"شاید ایک گھنٹے تک آجاؤں۔"

یوں کے اس فقرے نے شیلنو کو جیسے موت سے جگا دیا تھا۔

"آل رائٹ سر۔"

جعفری اُسے کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکلنے لگا۔ اکرم طوعاً و کرہاً اس کے پیچھے قدم اُٹھا رہا تھا۔

میٹنگ آدھ گھنٹے ہی میں ختم ہو گئی۔ جعفری جب کمرے میں آیا تو اس کا شیلنو بڑے انہماک سے پنجرے کے قریب جا کر پرندے کو دیکھ رہا تھا۔

جعفری نے ایک لمحے کے لیے اکرم شاہ کو گھور کر دیکھا مگر اکرم شاہ اس کی آمد سے بے خبر ہی رہا۔

چپڑاسی صاحب کا بریف کیس اندر لے آیا۔ اکرم شاہ کو اس حالت میں دیکھ کر ذرا ٹھٹکا مگر اس سے پہلے کہ وہ کسی ردِ عمل کا اظہار کرے، جعفری نے اُسے چلے جانے کا اشارہ کر دیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اکرم شاہ نے بے اختیار مُڑ کر دیکھا۔ جعفری بڑے اطمینان سے بریف کیس کھول کر اُس میں سے کاغذ نکال رہا تھا۔

"اوہ۔۔ آپ آ گئے سر!"

جعفری نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر فون کی طرف اشارہ کر دیا۔ اکرم نے ریسیور اٹھایا "نیاز اینڈ نواز" کہا اور ریسیور جعفری کی طرف بڑھا دیا۔

"یس پلیز۔ جی میں کاغذ لے آیا تھا۔ ٹائپ کروا کر بھیج دوں گا۔ تھینک یو۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔

"مسٹر اکرم!"

"جی سر۔"

"یہ آج کی میٹنگ کے MINUTES ہیں۔ ٹائپ کر کے انھیں مسٹر اجمل کے ہاں بھجوا دیں۔"

"آل رائٹ سر۔"

اکرم جانے لگا۔

"دیکھئے۔"

"اکرم فوراً رک گیا اور جعفری کی طرف آنے لگا۔

"کل چھٹی ہے۔ شام کے چار بجے میرے یہاں آ سکیں گے؟"

"ضرور ضرور سر۔"

"تھینک یو۔"

"یہ لفظ کہہ کر جعفری ایک فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

دن کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جعفری کے سجے سجائے ڈرائینگ روم میں وہ اور اکرم شاہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ سامنے ٹرالی پر چائے کی پیالیاں اور بسکٹ وغیرہ پڑے تھے۔

دونوں پیالیاں بھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا نوکر ابھی ابھی چائے بنا کر گیا ہے۔

"لیجئے مسٹر اکرم۔"

"جی، آپ۔ سر۔"

جعفری نے پیالی اٹھالی۔ اکرم شاہ نے بھی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔

"مسٹر اکرم۔"

"فرمائیے سر۔"

"آپ کو زحمت دی۔ چھٹی کے روز۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔ آپ نے میری عزت افزائی فرمائی ہے۔"

جعفری دو تین لمحے خاموش رہا اور چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔

"بات کوئی اہم بھی نہیں۔ بس مجھے یونہی خیال آگیا تھا۔ اصل میں میرا بیٹا کئی روز سے ایک خوبصورت پرندے کے لیے ضد کر رہا تھا۔ میں تلاش میں تھا۔ بس اتفاقاً یہ پرندہ بازار میں مل گیا، لے آیا۔"

جعفری پھر رک گیا۔ اکرم شاہ چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے نگاہیں جھکائے بیٹھا تھا۔

"مسٹر اکرم! آپ کو شاید خوبصورت پرندوں سے بڑی دلچسپی ہے۔"

"اوہ۔ کیا فرمایا آپ نے۔ جی جی۔ میں نے وہ۔ دیکھا تھا۔ سر" اکرم شاہ کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مضطرب ہو گیا ہے۔ جعفری اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا تھا۔

"پرندوں سے، خاص طور پر خوبصورت پرندوں سے ہر شخص کو دلچسپی ہوتی ہے۔" جعفری کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ضمن میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔ اکرم شاہ نے بے اختیار آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر چہرہ جھکا لیا۔

"مگر۔"

"آپ۔ سر کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس دلچسپی کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ بعضوں کو ان سے کم دلچسپی ہوتی ہے اور بعضوں کو زیادہ۔"

"جی ہاں۔"

"اور بعضوں کی دلچسپی کے پیچھے کوئی خاص واقعہ بھی ہوتا ہے۔"

جعفری کا یہ فقرہ سنتے ہی اکرم شاہ نے پہلو بدلا۔ جیسے کسی خیال کے آتے ہی بے چین ہو گیا ہو۔

جعفری نے جلدی سے چائے ختم کر کے پیالی رکھ دی۔ اکرم شاہ نے بقیہ چائے تین لمبے گھونٹوں میں حلق سے اتار لی۔

"آپ بھی۔ دراصل میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

"مسٹر اکرم! میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے سمجھنے کے لئے ذہن پر زور دینا پڑے۔ پرندوں سے محبت تو ایک عام واقعہ ہے لیکن جب کوئی کسی پرندے کو بے تحاشا دیکھنے لگے تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس حرکت کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہے۔ آپ نے کل جو حرکت کی تھی وہ اسی قسم کی تھی۔ شاید میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

نوکر آیا۔ جعفری نے اسے ٹرالی لے جانے کے لیے اشارہ کیا اور وہ ٹرالی لے جانے لگا۔

جب وہ دروازے پر پہنچ گیا تو جعفری نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ کو زحمت دی۔ چلئے کسی اور موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔"

اکرم شاہ نے ایک بار اور پہلو بدلا۔

"سر! آپ نے درست کہا ہے۔"

"یعنی۔"

"یہ ایک واقعہ۔" اکرم شاہ دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرتے ہوئے بولا۔ "یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب میرے ابا جی کو نوکری سے جواب مل گیا تھا اور گھر میں بعض اوقات کچھ کھانے کے لیے بھی نہیں ہوتا تھا۔ امی اِدھر اُدھر سے اُدھار مانگ کر کچھ لے آتی تھی اور ہم پیٹ بھر لیتے تھے۔ ایک روز ہوا یہ کہ پڑوس میں رہنے والا میرا ایک ہمجولی ایک پرندہ خرید لایا۔ یہ پرندہ ایک پنجرے میں تھا۔ میں ان دنوں ذرا احمق تھا۔ ابو سے ضد کرنے لگا کہ ایسا پرندہ مجھے خرید کر دے۔ وہ کیونکر خرید سکتے تھے ـــ؟ آپ کو بتایا نا۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ کے گھر میں بڑی غریبی تھی۔"

"میں نے بُری طرح چیخنا شروع کر دیا۔ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ابو کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ بولے۔

"بہلوے دیتے ہیں۔" اور مجھے گھر سے نکال کر بازار میں لے آتے۔ کبھی یہاں کھڑے ہوتے کبھی وہاں بیکار رُک جاتے۔ میں برابر روئے جا رہا تھا۔ ابو مجھے دلاسا دے کر ایک باغ میں لے آئے۔"

اکرم کہے جا رہا تھا اور جعفری آنکھیں بند کر کے ماتھے پر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی ٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ایک لڑکا پنجرہ اٹھائے اُدھر آ گیا۔ اس پنجرے میں بہت ہی خوب صورت پرندہ تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ ابو نے مجھے اس طرح اُدھر دیکھتے ہوئے پایا تو لڑکے سے بولا۔

"بیٹا! دکھاؤ تو۔" لڑکے نے پنجرہ بڑھایا تو میں نے فوراً پکڑ لیا اور نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ پنجرہ لیے فوراً بھاگ اٹھا۔ ابو پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ جب ٹانگوں نے جواب دے دیا تو میں رُک گیا۔ یہ شہر کی نئی آبادی تھی۔

جعفری ابھی تک اسی حالت میں بیٹھا تھا۔

"رات کا پہلا پہر تھا جب میں لوگوں سے راستہ پوچھ پوچھ کر گھر پہنچ گیا۔"

اکرم ذرا رُکا۔ پھر کہنے لگا۔

"میں جب بھی کوئی ایسا پرندہ دیکھتا ہوں تو اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ مجھے یہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔"

"ہوں۔"

"سر! میری خواہش ہے کہ میں اُسے کہیں دیکھ لوں۔"

"کِسے؟"

"جس کے ساتھ بچپن میں میں نے بڑی زیادتی کی تھی۔"

"دیکھ لو تو کیا کرو گے؟"

"میں گڑگڑا کر اُس سے معافی مانگ لوں گا۔ لیکن ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

جعفری مُسکرانے لگا۔ اکرم شاہ کو اس کی مسکراہٹ عجیب لگی۔

"ایسا ہو چکا ہے اکرم۔"

"ہو چکا ہے کیا مطلب؟"

"تم اُسے دیکھ رہے ہو۔"

"اکرم شاہ ایک دم پلٹا گیا۔

"آپ۔ سچ"

"بالکل"

اکرم شاہ صوفے سے اُٹھ کر نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔

"میں۔آپ سے۔"

جعفری بدستور مسکرائے جا رہا تھا۔

"اکرم امعافی مانگنے سے پہلے یہ تو پوچھ لو کہ میں وہ پنجرہ کہاں سے لایا تھا۔"

"آپ کے ابو نے خرید کر دیا ہو گا۔"

"نہیں۔"

"کسی عزیز نے تحفے کے طور پر دیا ہو گا۔"

"یہ بھی نہیں۔"

"آپ خود خرید کر لے آئے ہوں گے۔"

"میری جیب میں تو ان دنوں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی۔"

"تو۔ میں کیا عرض کروں؟"

جعفری دو تین لمحے خاموشی سے اکرم شاہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"میں وہ پنجرہ ۔۔ پرندوں کے ایک دکاندار سے اُس کی آنکھ بچا کر لے آیا تھا۔"

اکرم شاہ بھونچکا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

جعفری مسکرائے جا رہا تھا۔

اولڈایج ہوم

آخری سیڑھی اور اُس کے کمرے کے درمیان کم و بیش دس گز کا فاصلہ حائل تھا اور یہ فاصلہ اُس کے لئے ایک بڑی آزمائش کا مرحلہ بن جاتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتا تھا تو اُسے کسی قدر اطمینان ہو جاتا تھا کہ اُس کے پوتے اور پوتیوں کے حملے سے اس کا کمرہ محفوظ ہے مگر جب اس کے دونوں پٹ کھلے ہوتے تھے اور دروازے کے باہر کمرے کی کوئی نہ کوئی چیز پڑی ہوتی تھی تو اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی اور چہرے کی بوڑھی رگیں زیادہ نمایاں ہو کر اس کی کرب انگیز دلی کیفیت کا اظہار کرنے لگتی تھیں۔

اُس وقت کمرے کے دونوں پٹ کھُلے تھے۔

"او میرے خدایا!" اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

جس غارت گری کا اُس نے اندازہ لگایا تھا وہ صورتِ حال سے کچھ کمتر ہی تھی۔ اُس روز محمود اور اُس کی دونوں بہنوں نے معمول سے زیادہ ہی تباہی مچا دی تھی۔

پلنگ کی چادر جسے اُس کی بہو نے صرف ایک روز پہلے بدلا تھا، اس پر جا بجا مکھیاں بھِنبھنا رہی تھیں۔ انہوں نے پلنگ پر بیٹھ کر کوئی میٹھی چیز کھائی کم اور گرائی زیادہ تھی اور ہر طرف بکھرے ہوئے ریزوں نے مکھیوں کو دعوتِ عام دے دی تھی۔

میز پر کتابیں وہ بڑی ترتیب کے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ اُسے اپنی کتابوں سے بڑی محبت تھی اور انہی کا مطالعہ کر کے اپنا وقت بِتاتا تھا۔ یہ ساری کتابیں منتشر حالت میں پڑی تھیں۔

قالین پر اگالدان اُلٹا پڑا تھا۔ حقہ کمرے کے ایک گوشے میں رکھا ہوتا تھا وہ کمرے کے

عین وسط میں اس عالم بیچارگی میں پڑا تھا کہ اُس کی چلم غائب تھی اور چلم کے کوئلے اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔

پنشن کے لئے گھر سے جانے سے پہلے وہ دھوبی سے دھلے ہوئے کپڑے لا کر کرسی کے اُوپر رکھ گیا تھا کہ واپس آ کر انھیں الماری کے خانے میں رکھ دے گا۔ ان میں سے کوٹ نکل کر پلنگ پر پڑا تھا۔ محمود نے ضرور اسے پہن کر دادا جان بننے کی کوشش کی ہوگی۔

ایسے میں اس کا صبر و قرار جواب دے جاتا تھا اور وہ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر اپنی بہو کو بڑے غصے سے مخاطب کرتا تھا اور اس روز بھی اُس نے یہی کیا تھا۔

"زینب! تم اپنے بچوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتیں اوپر آ کر دیکھو تو کیا حالت کر دی ہے میرے کمرے کی۔"

بچے اپنے دادا جان کو گھر کے اندر آتے دیکھ کر چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ اس لئے زینب انھیں بے تحاشا بددعائیں دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

"میں کیا کر دوں بابا جی! آپ انھیں کیوں نہیں سمجھا لیتے؟"

اپنی بہو کا یہ رویہ اُس کے لئے حیران کن تھا۔ وہ تو سسر کی غصیلی آواز سنتے ہی دروازے کی طرف بھاگتی تھی اور محمود یا اس کی کوئی بہن ہاتھ آ جاتی تھی تو مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتی تھی۔ مگر اُس روز اُس نے ایک فقرہ کہہ کر ہی اپنی طرف سے معاملہ ختم کر دیا تھا۔

ماں بچوں کو بددعائیں دیتی تھی۔ تو اُس کا غصہ بھی ذرا دب جاتا تھا لیکن اُس روز اس نے جس ردِعمل کا اظہار کیا تھا وہ اُسے بڑا غیر مناسب لگا۔ وہ کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔ اُس کی پیشانی زیادہ شکن آلود ہو گئی تھی اور سانس شدید غصے کی حالت میں تیزی سے آنے جانے لگا تھا۔

"کیا اس نے بچوں کو شہ دی ہے؟" اُس نے خود سے سوال کیا اور وہ نیچے آ گیا۔

زینب نلکے کے نیچے کپڑے دھو رہی تھی۔

"زینب! تم نے ان بدتمیزوں کو اتنی کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے۔ انھیں کمرے میں جانے ہی

کیوں دیتی ہو۔ تمہیں خبر نہیں کہ میرے کمرے کے اندر جا کر وہ کیا کرتے ہیں؟"

زینب نے ہاتھ میں ڈنڈا اٹھا رکھا تھا جسے وہ کپڑوں پر مار رہی تھی۔ اپنے سسر کے الفاظ سن کر اس نے بے دھیانی میں ڈنڈا انکے پر زور سے مار دیا اور چمک کر بولی۔

"یہ میری کمبخت اولاد ہے تو آپ کی کچھ نہیں لگتی؟"

زینب اس کے سوال کا کیا جواب دے رہی تھی۔ اس کے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"میری کچھ لگتی ہے یا نہیں لگتی مگر۔"

زینب تڑپ اٹھی۔ فوراً بولی۔

"کچھ نہیں لگتی ناں؟"

"زینب! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری چیزوں کو اس طرح تباہ کیا جائے۔"

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ پکڑ کر گلے گھونٹ دیں ان کے۔"

ان کی بہو کو کیا ہو گیا ہے۔ ترکی بہ ترکی جواب دے رہی ہے۔ بیٹا بھی اپنے کمرے میں موجود ہے اسے ضرور صورتِ حال کا علم ہو چکا ہے مگر نہ تو باہر آیا ہے نہ بچوں کی معمول کے مطابق سرزنش کی ہے۔

"اچھا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔"

اور وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر آ گیا۔

میرزا عبدالقیوم نے ساری زندگی صوبائی حکومت کے ایک دفتر میں ملازمت کی تھی۔ وہ معمولی کلرک سے اعلیٰ افسر کے عہدے تک پہنچا تھا اور اس کی ترقی کا حقیقی سبب اس کی ایمانداری، دیانتداری اور منصبی فرائض سے گہری دلچسپی تھی۔

ملازمت کے اختتام پر دفتر کے سربراہ نے بڑی کوشش کی تھی کہ اس کی دفتر سے وابستگی میں توسیع کر دی جائے مگر وہ خود اس پر راضی نہ ہوا۔ اپنے دوستوں سے تو اس نے یہی کہا کہ میں نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے اب یہ دوسروں کا حق ہے کہ وہ آگے بڑھ کر میری ذمہ داریاں سنبھالیں۔ میں کسی کا حق مارنا نہیں چاہتا۔ اس کے دوستوں نے قطع ملازمت کا یہ جواز تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن دل کی بات اس نے کسی سے

بھی نہیں کبھی تھی اور دل کی بات یہ تھی کہ وہ دفتری ہنگاموں سے دُور ہو کر بڑے پُرسکون ماحول میں بقیہ زندگی بسر کرنے کا آرزومند تھا۔

خاموشی، سکون اور اپنا دن اور اپنی رات، یہ تھی اُس کی آرزو جو چھٹی کے وقت اپنے کاموں سے فراغت پانے کے بعد یا گھر میں اپنے مخصوص کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی اور وہ ان لمحوں کی گود میں چلا جاتا تھا۔ جب دفتر سے رشتہ منقطع کرنے کے بعد خاموشی، سکون اور اپنے سارے معمولات میں مکمل آزادی حاصل کر لے گا۔ اس ماحول کا تصور کرتے وقت اُسے ایک عجیب سی خوشی مل جاتی تھی اور وہ دیر تک اس تصور میں ڈوبا رہتا تھا۔

پہلے دن جب صبح اٹھ کر اُس نے یہ خیال کیا کہ اب سارا دن اس کا اپنا ہے اور اُسے کہیں بھی آنا جانا نہیں ہے۔ کوئی بھی فریضہ ادا کرنا نہیں ہے تو اس کا دل سرخوشی کی ایک ایسی کیفیت محسوس کرنے لگا جسے وہ اپنی تمام تگ و دَو کا حاصل سمجھتا تھا۔

وہ خوش تھا، مطمئن تھا۔

اُس نے اپنے کمرے کو ٹھیک کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی بہو سے جو بچوں کے ساتھ ناشتا لے کر آ گئی تھی، کہا۔

"زینب! اب تو یہی میری دنیا ہے۔ یہ میرا کمرہ، اِسے ٹھیک ٹھاک کرنا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ضرور بابا جان۔ جو کچھ آپ چاہتے ہیں ہو جائے گا۔ حکم کیجیے۔" اُس کی بہو نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ صوفہ سٹ پرانا ہو گیا ہے۔"

"نیا خرید لیں گے۔"

"میز بھی۔"

"یہ بھی نئی۔"

"بس ٹھیک ہے۔"

اُس کی بہو مسکرا رہی تھی۔

"بابا جان! میں آج ہی پرانی چیزیں نکلوا دوں گی۔ صوفہ سیٹ خرید لائیں گے اور بھی سب کچھ۔ محمود کے ابو بھی کہہ رہے تھے کہ بابا جان اب گھر پہ ہی رہا کریں گے۔ انھیں ہر طرح آرام پہنچایئے۔"

چند روز میں کمرہ ٹھیک ہو گیا اسے ٹھیک کرنے میں اُس نے خود کم اور گھر والوں نے زیادہ حصّہ لیا تھا۔

ایک ہفتہ اِس انداز میں گزرا جس انداز میں وہ گزارنا چاہتا تھا۔ دفتر کے پرانے ساتھی اُس سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ اُس کا پوتا اور دونوں پوتیاں چائے اور کھانا اُس کے کمرے ہی میں پہنچاتے رہے۔ اس قسم کا ہنگامہ ضرور رہا لیکن اُسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ احباب آتے ہیں تو آئندہ آنے سے رُک جائیں گے۔ اس کی بہو بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے میں جو شور کرتی ہے یہ بھی اُس وقت ختم ہو جائے گا یا بہت حد تک تھم جائے گا جب وہ ان کی ماں کو سمجھا دے گا کہ بچوں کے ساتھ مادرانہ شفقت کا رویہ اختیار کرے۔ نیچے اوپر آتے ہیں اپنے جوتوں کے ساتھ اندر آ کر قالین خراب کر دیتے ہیں۔ تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ وہ انھیں بتا دے گا کہ اوپر میرے کمرے میں آؤ تو جوتے اتار کر آؤ۔

تین ہفتے بیت گئے اور پھر اُس کے ذہن میں اندیشہ ہائے دور و دراز اپنا سایہ ڈالنے لگے اُس نے سوچا تھا کہ دفتر کے کچھ لوگ آتے ہیں تو اظہارِ محبت کے لیے آتے ہیں۔ آخر کب تک یہ اظہار ہوتا رہے گا۔ مگر اتنی مدت صبر سے کام لینے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

پہلے اُس کے پُرانے اور نئے ساتھی محض اسے اُس کے شاندار کیریر پر مبارکباد دینے کے لئے آتے تھے اب وہ اُس سے ہدایات لینے کے لئے آنے لگے تھے۔

"سر! ایسے کاغذات کن فائلوں میں رکھے جاتے ہیں۔ بڑے افسر کے ہاں جا کر سوال کس طرح

کرنا چاہیے؟"

یہ لوگ عام طور پر یہی سوال کرتے تھے اور وہ جواب دے دے کر بور ہو جاتا تھا۔

اِس سے بڑی کوفت اُسے اپنے پوتے اور پوتیوں سے ہونے لگی تھی۔ وہ سیر و تفریح کی خاطر، کسی سے ملاقات کے لیے، کوئی چیز خریدنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا تھا تو بچے سکول سے واپس آ کر گھر میں ہوتے تھے تو بے تکلف اُس کے کمرے میں آ جاتے تھے اور طوفانِ بدتمیزی مچا دیتے تھے۔ چیزوں کی بے ترتیبی دیکھ کر اُسے دُکھ ہونے لگا تھا۔

اپنے کمرے کی تباہی پر اسے ہر بار ذہنی کوفت ہوتی تھی مگر جب اُس کی بہو بچوں کو بُری طرح ڈانٹ ڈپٹ دیتی تھی بلکہ کسی نہ کسی کی پٹائی بھی کر دیتی تھی اور اُس کا بیٹا بھی اگر گھر میں ہوتا تھا تو اِس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لینے سے باز نہیں رہتا تھا تو اس کا غصہ کسی قدر ہلکا ہو جاتا تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آ جاتا تھا مگر اُس روز تو اُن دونوں نے ایک ایسا رویہ اختیار کر لیا تھا جو اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

بہو کا فقرہ "تو میں کیا کر سکتی ہوں، پکڑ کر گلے گھونٹ دیں اِن کے۔" اس کے ذہن پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ بغیر کسی مقصد کے گلیوں اور بازاروں کے چکر لگاتا رہا۔ باغوں میں گھوما، کتابوں کی دکان پر کچھ کتابیں خریدیں اور ایک اخبار بھی۔

گھر پہنچ کر وہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اُوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر پر گر کر ایک نئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ کتاب پڑھنا ممکن نہیں تھا اور اُس کے اعصاب پر کچھ ایسا بوجھ پڑ چکا تھا کہ بستر سے اُٹھ کر بجلی کے سوئچ بورڈ تک جانا دوبھر لگ رہا تھا۔

وہ کتاب بند کر کے لیٹ گیا۔

بہو اور بیٹے کی بے نیازی اُسے یاد آ گئی اور اپنے وہ الفاظ بھی جو اس نے گھر سے نکلتے

وقت اپنی بہو سے کہے تھے: "اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔"

"مگر میں کر کیا سکتا ہوں۔ کہاں سر چھپاؤں جاکر۔ کدھر جا سکتا ہوں؟"

یہ سوچ کر اُس پر ایک گہری افسردگی طاری ہو گئی۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اچانک اُس کی بند آنکھوں پر کسی نرم سی شے نے مَس کیا۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اُس کی بڑی پوتی کلثوم پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"دادا ابو! سو گئے تھے آپ؟"

"کیوں آئی ہو یہاں؟" وہ گرجا۔

بچی کی آنکھوں میں جو میٹھی سی معصومانہ مسکراہٹ جھلک رہی تھی فی الفور غائب ہو گئی۔

"دادا ابو۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"کیا ہے؟" وہ دوبارہ گرجا۔

"وہ۔ دادا ابو! کھانا۔"

"نہیں۔ بھوک نہیں ہے مجھے۔ بھاگ جاؤ فوراً۔"

"کلثوم کمرے سے باہر جانے لگی۔

جب وہ کمرے میں آیا تھا تو اُس نے اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالی تھی۔ آتے ہی بستر پر گر پڑا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ کمرے کی صفائی ہو گئی ہے۔ مگر کتابیں بدستور منتشر ہیں۔

"جاہل عورت۔"

وہ اپنی اَن پڑھ بہو کو جاہل سمجھتا تھا۔ اس کے بیٹے نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ شروع ہی سے بہو کو پسند نہیں کرتا تھا اگرچہ وہ اُس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتی تھی۔

چند منٹ بعد بہو اور بیٹا آ گئے۔

"بابا جان! کھانا کھا لیجئے ناں۔" یہ اُس کی بہو کے الفاظ تھے۔

"نہیں۔ کہہ جو دیا بھوک نہیں ہے۔ کیوں پریشان کرتے ہو مجھے۔"

"مگر ابو آپ نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔" اس کا بیٹا بولا۔

باپ نے خشمگیں نظروں سے بیٹے کو دیکھا اور بیٹے نے نظریں جھکا لیں۔

کچھ اور اصرار کرنے کے بعد دونوں مایوس ہو کر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد اُس نے پھر کتاب اٹھائی۔ لیکن آدھ صفحہ پڑھ کر ہی اُسے چھوڑ دیا۔ سرہانے کے اوپر اخبار بھی کھلا ہوا پڑا تھا۔ کتاب ایک طرف رکھ کر اُس نے اخبار اُٹھا لیا۔ وہی دہشت ناک خبریں تھیں جو اخباروں میں نمایاں طور پر چھپتی ہیں۔ یکایک اُس کی نگاہ ایک اشتہار پر پہنچ کر رک گئی۔

اِس اشتہار میں امریکی طرز پر ایک اولڈ ایج ہوم (OLD AGE HOME) کے قیام کی خوش خبری سنائی گئی تھی اور اُن بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں کو اِس ہوم کے مالک احمد جاوید سے ملنے کو کہا گیا تھا جو بڑھاپے میں پرسکون زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں۔ نیچے احمد جاوید کا پتا درج تھا۔

اُس نے سانس روک کر یہ خبر پڑھی۔

"یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔"

اُس نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا اور اخبار کو لپیٹ کر تپائی کے اوپر رکھنے سے پیشتر وہ تین بار اِس اشتہار کو پڑھ چکا تھا۔

صبح اُس کی بہو ناشتا لے کر آ گئی۔

"باجی! خدا کے لیے انکار نہ کریں۔"

بہو نے یہ الفاظ بڑی لجاجت سے کہے تھے۔ اُس نے بہو کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور وہ اپنے سسر کو بڑی ممنونیت سے دیکھنے لگی۔

جلدی جلدی ناشتا کرنے کے بعد اُس نے لباس تبدیل کیا اور احمد جاوید سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

احمد جاوید کی عمر پچاس پچپن سے کم نہیں تھی مگر بڑا چاک چوبند دکھائی دیتا تھا۔ لباس فیشن کے

مطابق پر چوڑی پیشانی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ بڑی خوشی سے اس نے خیر مقدم کرتے ہوئے اُسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ نام وغیرہ پوچھا۔ حالات دریافت کئے اور جب اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جس شخص سے وہ ملاقات کر رہا ہے وہ ہوم میں داخل ہونے کے لئے بیقرار ہے تو بولا۔

"مجھے آپ کی تشریف آوری پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ کی خواہش کی تکمیل کر کے مجھے اور خوشی ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ امریکا میں گزارا ہے۔ اس کی کچھ چیزیں مجھے پسند نہیں آئیں۔ کچھ پسند آئی ہیں اور ایک چیز جو بہت زیادہ پسند آئی ہے وہ "اولڈ ایج ہوم" کا سسٹم ہے۔ میں کئی بار اس قسم کے ایک ہوم میں گیا تھا اور وہاں رہنے والوں کو بہت مسرور اور مطمئن پایا تھا۔ سچ کہتا ہوں اُن کے چہروں پر مجھے جو سکون نظر آیا تھا وہ قابلِ رشک تھا۔"

احمد جاوید نے ذرا رک کر اپنے ملاقاتی کا غور سے چہرہ دیکھ کر اُس کے ردِ عمل کو بھانپنے کی کوشش کی۔ یہ ردِ عمل اُس کی منشا کے عین مطابق تھا۔

"میں نے قیام امریکا کے دوران ہی اپنے ہاں اولڈ ایج ہوم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے محترم! آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سن رسیدہ افراد کو بڑے سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ان بیچاروں کو نہیں ملتا۔ اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر میں نے زرِ کثیر صرف کر کے ایک بہت آرام دہ اور ہر لحاظ سے مکمل ہوم بنا لیا ہے۔ اخراجات کے لیے بڑی معمولی رقم مقرر کی ہے۔"

"کتنی؟" اُس نے پوچھا۔

"صرف ایک ہزار ماہانہ۔ جو ہوم کی سہولتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔"

"ٹھیک۔۔ اور کچھ؟"

"اور کچھ؟ بس آپ چلئے میرے ساتھ۔ میں آپ کو ہوم دکھا دوں۔"

چائے پینے کے دس منٹ بعد وہ احمد جاوید کے ساتھ ایک خوب صورت، سجے سجائے کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کمرے میں سب کچھ موجود تھا۔ صوفہ سیٹ، کرسیاں، میز، تپائیاں، رنگ ٹیلیفون، الماریاں،

فرش پر قالین، دیواروں پر رنگا رنگ تصویریں۔ ایک طرف وال کلاک۔

احمد جاوید نے مزید سہولتوں کی تشریح کی۔

"ایک ملازم اور ایک ملازمہ خدمت کے لیے حاضر ہیں، گھنٹی بجائیے۔ ایک منٹ میں موجود۔ ناشتا کھانا وقت پر اور کیا چاہیے پُرسکون زندگی کے لیے؟"

اسے کمرہ بہت پسند آیا۔

"اور کمرے بھی ہوں گے اور ان میں"

احمد جاوید بات سمجھ گیا۔

"اور کمرے ضرور ہیں مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ابھی اس سسٹم کی ابتدا ہوئی ہے۔ لوگ آتے جائیں گے اور ایک دن یہ ہوم واقعی اولڈ ایج ہوم بن جائے گا۔"

"تو ابھی صرف میں؟"

احمد جاوید نے جواب دیا۔

"آپ کی طرح ایک صاحب آئے تھے۔ بیحد مطمئن اور خوش تھے۔ افسوس انھیں ایک مُوذی بیماری نے کچھ زیادہ مدت خوشی سے زندگی بسر کرنے نہ دی۔ فوت ہو گئے۔"

اُس دن دوسرے پہر وہ اپنی کتابیں اور کپڑے لے کر، گھر والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر احمد جاوید کے اولڈ ایج ہوم میں آ گیا۔

شام تک سارا وقت بُک شیلف میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھنے، کمرے کے فرنیچر کا اچھی طرح جائزہ لینے، نوکر اور نوکرانی سے تعارف ہونے میں گزر گیا۔ نوکر کا نام بخشو تھا اور نوکرانی رشتے میں اس کی خالہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

ہاجرہ نے بڑے سلیقے سے چائے کی ٹرے اُس کے آگے تپائی پر رکھی تھی اور خود مؤدب ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

"بس جاؤ۔"

"جی کوئی حکم؟"

"نہیں کوئی نہیں۔"

کتنی تربیت یافتہ نوکرانی ہے۔ اُسے اپنی بہو یاد آ گئی۔ جو اُس کے ایک مرتبہ کہنے پر اول تو چائے بھیجتی ہی نہیں تھی۔ دو تین بار کہتا تھا تو کوئی بچہ چائے لے کر آتا تھا جو کافی ٹھنڈی ہوتی تھی۔ دو تین گھونٹ بھر کر وہ پیالی ہاتھ سے رکھ دیتا تھا اور جب سیر کے لئے باہر جاتا تھا تو کسی ریستوران میں بیٹھ کر خوشگوار ماحول میں چائے پی لیتا تھا۔

چائے پینے کے بعد اُس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر فضا میں دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اُس روز فضا کچھ بدلی بدلی لگتی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں نے اُس کے ماتھے کو چھُوا تو اسے ایک نئی لذت کا احساس ہُوا۔

"خواہ مخواہ اتنا وقت اُس منحوس گھر میں بتایا۔ کاش اِس ہوم کا علم ریٹائرمنٹ کے وقت ہی ہو جاتا۔"

اس نے سرد ہوا میں لمبا سانس لے کر سوچا۔

شام کو کمرے سے باہر نکلا اور سیر کو روانہ ہو گیا۔

گھنٹہ بھر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد کمرے میں آ گیا۔ احمد جاوید کرسی میں بیٹھا اس کا منتظر تھا۔

"ویلکم سر!" تعظیماً اُس نے اُٹھ کر کہا۔

"شکریہ۔"

"میں صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا ہوں کہ کسی قسم کی دقت۔ کوئی تکلیف۔" احمد جاوید نے کرسی میں بیٹھے ہوئے کہا۔

"جی بالکل نہیں۔ بہت خوش ہُوں۔"

"آپ یہاں ہمیشہ خوش ہی رہیں گے۔ جلد ہی ایک صاحب آ جائیں گے۔ تنہائی نہیں رہے گی۔"

"کوئی صاحب آنے والے ہیں؟" اس کا سوال تھا۔

"جی ہاں - انھیں بھی بڑھاپے میں سکون کی تلاش ہے۔ جلد جلد اپنے معاملات نپٹا رہے ہیں بڑے خوش مزاج آدمی ہیں - امریکا میں بھی کئی سال گزار چکے ہیں - یہ آپ کے ساتھی بنیں گے۔"

"بہت خوب۔"

اور احمد جاوید شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔

رات کا کھانا آ گیا۔ سادہ کھانا تھا مگر مزیدار۔ کھانا کھا کر اس نے چائے منگوائی اور اس سے فارغ ہو کر کچھ دیر ایک کتاب کا مطالعہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

"یہی سکون ہے جس کی مجھے تلاش تھی - خوش قسمت ہوں کہ میرا خواب پورا ہو گیا ہے۔"

وہ جب تک جاگتا رہا، ایسے ہی خوش آئند تصورات اس کے ذہن پر چھائے رہے پھر وہ سو گیا۔

صبح اُٹھا تو اس کا جی بے اختیار چاہا کہ کچھ گنگنائے ؎

خدا جانے یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے دنیا کو

کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسین معلوم ہوتی ہے -

دوسرا مصرع وہ بار بار گنگناتا رہا۔

ملحقہ غسل خانے میں وہ نہایا دھویا - نکلا تو چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔

"یہ سہولت اُس منحوس گھر میں کہاں تھی؟"

چائے پی کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

فضا میں روشنیاں اترتی چلی جا رہی تھیں - بازاروں اور سڑکوں پر زندگی جاگ اٹھی تھی۔ بچے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں مدرسوں کو جا رہے تھے - اُسے اپنے پوتے اور پوتیوں کا خیال آ گیا۔ "بدتمیز کہیں کے" - اور وہ کھڑکی سے الگ ہو گیا۔

سکون کے دن تھے - سکون کی راتیں تھیں اور وہ خود کو ایک ایسا پنچھی محسوس کرتا تھا جو پنجرے کی قید سے رہائی پا کر فضا کی وسعتوں میں پوری آزادی کے ساتھ اُڑ رہا ہو۔

ایک ہفتہ بیت گیا - ایک اور ہفتہ بیتا اور وہ شام کی چائے پی کر سیر کے لیے جانے ہی والا تھا کہ

اماں ہاجرہ نے اوپر آ کر اُسے اطلاع دی کہ آپ کے گھر والے آئے ہیں۔

"کیا ہے۔ آ گئے ہیں تو ہُوا کیا ہے۔ مجھے واپس لے جانے سے تو رہے۔ چلے جائیں گے تھوڑی دیر بیٹھ کر۔"

"بُلا لو۔"

اُس کا بیٹا، بہو اور پوتا اور پوتیاں آ گئیں۔ بہو نے پھل کی ٹوکری اُٹھا رکھی تھی۔

"سلام علیکم ابو، سلاماں لیکم باباجی، دادا جان سلام علیکم۔"

آوازیں بلند ہوئیں۔ اُس نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میاں بیوی صوفے پر اور بچے نیچے بیٹھ گئے۔

"ابو آپ یہاں خوش ہیں" اُس کے بیٹے نے سوال کیا۔

"بہت خوش ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔"

"اچھا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں دُکھ ہے کہ آپ کو خوش اور مطمئن نہیں کر سکے تھے" بیٹے کے لہجے میں دبا دبا دکھ تھا۔

"باباجی اسے کیا کہتے ہیں" بہو نے پوچھا۔

"اولڈ ایج ہوم۔"

"اول ___" بہو کی زبان پر پہلا لفظ ہی نہ آ سکا۔

"یہ ہوتا کیا ہے باباجی۔"

اس نے گلو خلاصی کے لیے دونوں ہاتھ لہرائے۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں۔"

بیٹے نے باپ کو پھل کی ٹوکری دی۔

"مجھے یہاں کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ لے جاؤ بچوں کے لئے۔"

"نہیں ابو! یہ آپ کے لیے لائے ہیں۔"

باپ نے بیٹے کی طرف ٹوکری بڑھا دی تھی۔

اس دوران میں بچوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ دادا محمود کی طرف دیکھتا تھا تو وہ فوراً اپنا سر جھکا لیتا تھا۔ یہی حال اُس کی بہنوں کا بھی تھا۔

"کتنی چالاکی سے تیمارداری کا ڈراما کر رہے ہیں۔" یہ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا اٹھا۔

گھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کون کون اُسے ملنے کے لیے گھر آیا اور اُسے کیا بتایا گیا۔ ہمسایوں کے سامنے اس کے بارے میں کیسی کیسی غلط بیانی کی گئی۔ یہ سب کچھ اُسے بتایا گیا۔

"خبردار کسی کو بھی یہاں کا علم نہ ہو۔" اُس نے تاکیداً کہا۔

"جی ابو ہم نے کسی کو نہیں بتایا۔ آپ نے جو کہہ دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ جانے لگے تو بیٹے نے ایک بڑا سا لفافہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ وہ خط تھے جو اس کے نام اُس کی عدم موجودگی میں آئے تھے۔

اُن کے چلے جانے کے بعد اُس نے لفافے سے خط نکالے اور ایک کو پڑھنے لگا۔

ایک خط کتابوں کی ایک دکان سے آیا تھا جس میں اسے NEW ARRIVALS کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ دوسرا خط اس کے پرانے دفتر کی یونین کے سیکرٹری کی طرف سے تھا جس میں اس سے درخواست کی گئی تھی کہ اپنے پرانے ساتھی نیر وزیر دین کی الوداعی پارٹی میں شامل ہو کر ممنون فرمائے۔ دو خطوں میں اُس کے دوستوں نے اپنے بیٹوں کی شادی پر اُسے مدعو کیا تھا۔

کتابوں کی دکان والا خط اُس نے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور باقی پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔

"اب میرا ان لوگوں سے کیا تعلق واسطہ؟"

ایک مہینہ گزر گیا۔ نوکر اور نوکرانی نے اپنی ذمے داریوں میں کبھی کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں کی تھی۔ مگر اُس روز صبح کی چائے چھ بجے کی بجائے ساڑھے سات بجے ملی۔

"معاف کر دیا باجی۔" ہاجرہ نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ "چائے دیر سے ملی۔ دیر سے جو آئی ہوں۔"

"اچھا۔" اُس نے ہاجرہ کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

"وہ جی۔ بیمار ہو گیا تھا۔"

"کون بیمار ہو گیا تھا۔" اُس نے یونہی سوال کر دیا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"جی وہ میرا پوتا جی۔ شاہد کہہ رہے جی۔ بیمار ہی چھوڑ کر آئی ہوں۔ میرا دھیان اُسی میں لگا ہوا ہے۔ دعا کریں بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہو جائے۔"

وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا اور وہ ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"دُعا کریں گے ناں۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ناشتا تھوڑی دیر بعد یا ابھی۔" ہاجرہ نے ٹرے اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑی دیر بعد۔"

اور یہ الفاظ سن کر وہ چلی گئی۔

وہ جب کھڑکی کی طرف جا رہا تھا تو اُسے اپنے پوتے کا خیال آ گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی پوتے اور پوتیوں کے چہرے اُس کے سامنے آ گئے۔ "اُس روز کتنے مؤدب ہو کر یہاں بیٹھے تھے۔" وہ مسکرانے لگا۔

دھوپ پھیل چکی تھی۔ بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اُس کی نگاہیں دُور سکول کی عمارت پر پڑیں۔ بچے قطاروں میں کھڑے تھے۔ دُعا کر رہے ہوں گے۔ وہی دُعا جو اُس کا پوتا اور پوتیاں گھر آ کر کبھی کبھی اُسے سنایا کرتی تھیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

وہ کھڑکی میں کھڑا رہا۔ قریب کمرے کے اندر شور ہوا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ بخشو تھا جو ناشتے کر

آیا تھا۔ بیڈ ٹی اور ناشتا ہاجرہ ہی لایا کرتی تھی۔ ناشتے کے بعد بخشو حقہ تازہ کر کے لاتا تھا۔ ناشتا لانا اُس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔

"ہاجرہ کہاں ہے؟" اُس نے کھڑکی سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اُسے اپنے پوتے کا بڑا فکر ہے۔ گھر چلی گئی ہے"۔

"زیادہ بیمار ہو گیا ہے"۔

"کہتی تھی بڑا کمزور ہو گیا ہے"۔

وہ کرسی میں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔ چند منٹ گزرنے پر بخشو حقہ لے آیا۔

"تازہ اخبار لے آؤں بازار سے؟

"نہیں میں خود لے آؤں گا"۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان کے ساتھ حقے کے کش لگاتا تھا۔ اُس وقت بھی وہ کش لگا رہا تھا اور جلد باہر نکلنا چاہتا تھا۔

اخبار خرید کر وہ اپنی منزل متعین کئے بغیر چلتا گیا۔ اخبار کی بڑی خبریں وہ کسی باغ میں بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ اُس روز بھی ایک باغ کے اندر بنچ پر بیٹھ گیا۔

ایک دم شور بپا ہونے لگا۔ اُس نے سامنے دیکھا۔ لڑکے آدھی چھٹی کے وقت خوش خوش شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل رہے تھے۔

اُسے سکول کی عمارت شناسا محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ اُس سکول کے پاس بیٹھا ہے جس میں اُس کا پوتا اور پوتیاں پڑھتی ہیں۔

"پتا نہیں میں یہاں کیسے آ گیا"۔

وہ اخبار سرسری طور پر دیکھنے لگا۔ چند منٹ میں سارا اخبار دیکھ لیا۔ اُٹھا تو اُس کے پاس وہ تینوں کھڑے تھے۔

"تم ۔۔۔؟"

تینوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیئے۔

"ٹھیک ہو؟"

پھر اسی طرح سر ہلنے لگے۔

"دادا ابو جی۔ ہم۔"

"کبھی۔ دادا ابو جی ــــــ" کلثوم بس اتنا کہہ سکی۔

نرگس نے کچھ نہ کہا صرف اپنا سر ہلاتی رہی۔

"کیا یہ وہی بچے ہیں جنھوں نے اسے اس قدر پریشان کر دیا تھا۔ اب کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

آدھی چھٹی کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ سکول کی گھنٹی اس کا اعلان کر رہی تھی۔

"جاؤ اپنی کلاسوں میں۔"

اور وہ باغ سے باہر نکلنے لگا۔ باہر نکل کر وہ غیر ارادے سے رک گیا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ تینوں ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ واپس پہنچا۔ بخشو کمرے کی صفائی کر چکا تھا۔

"جناب! یہ آپ کا ہے۔" بخشو کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ "صفائی کرتے ہوئے وہاں سے ملا ہے۔" بخشو نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ میرا تو نہیں۔ دکھاؤ۔"

اُس نے لفافہ لے لیا۔

"شاید یہ اُن صاحب کا ہے جو پہلے یہاں رہتے تھے۔"

"وہ باباجی۔ بے چارے یہیں مر گئے تھے۔" بخشو نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ "کھانا کتنے بجے جی۔ باجرہ نہیں ہے ناں۔ میں بھی پکا لیتا ہوں جی۔"

"جب پکا چکو تو لے آنا۔"

بخشو چلا گیا۔

وہ کرسی میں بیٹھ گیا تھا۔ لفافہ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ لفافے پر پتا درج تھا۔

برخوردار الطاف احمد،

مکان نمبر ۳۱ - ڈی - محلہ ست رنگاں، اندرون موچی گیٹ

لاہور

"یہ الطاف احمد کون تھا، برخوردار کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھنے والے کا کوئی چھوٹا عزیز ہوگا۔ ممکن ہے بیٹا ہو۔ تو اُس نے بیٹے کو کیا لکھا تھا اور یہ خط پوسٹ کیوں نہیں ہوا تھا، یہیں کیوں پڑا رہا؟"

ایسے سوالات نے اُس کے ذہن کا احاطہ کر لیا تھا۔

"اب وہ تو ہے نہیں جس نے خط لکھا تھا۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟" اس نے لفافہ کھولنے کے لئے جواز تلاش کر لیا۔

ذرا سی ہچکچاہٹ — اور پھر لفافہ چاک ہو چکا تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔ الفاظ ٹیڑھے میڑھے تھے۔ لگتا تھا لکھنے والے کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

میرے عزیز بیٹے

تم پر اللہ کی سلامتی ہو

چار دن سے میری حالت کافی خراب ہو گئی ہے۔ ہارٹ بار بار سنک کرتا ہے۔ زندگی سے اب مایوسی ہی مایوسی ہے۔

میرے عزیز اور پیارے بیٹے! تمہاری ماں کے انتقال کے بعد میں بری طرح یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ بالکل بے آسرا اور بے سہارا ہو گیا ہوں۔ مجھے تم سے، تمہاری آپا سے یہ شکایت ہو گئی تھی کہ تم لوگ میری پروا نہیں کرتے۔ تم لوگوں کا سارا وقت اپنے بچوں، دوستوں اور سہیلیوں کے لیے وقف ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا رد عمل یہ ہوا تھا کہ میں اپنے گھر سے بیزار ہو گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگوں۔ انہی دنوں احمد جاوید

سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ امریکا میں اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں اولڈ ایج ہوم' بوڑھوں کے لیے ایک جنت ہوتی ہے جس میں رہنے والے بڑی پرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے اسی طرز کا ہوم بنا لیا تھا اور میں اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اُس کے ہوم میں آ گیا تھا۔

یہ چند ہفتے جو میں نے یہاں گزارے ہیں میرے لیے عارضی سکون لیکر آئے تھے۔ بیٹا! جب سے بیمار ہوا ہوں۔ تم سب لوگ مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔ اپنے کنبے کی جُدائی مجھ پر شاق گزرنے لگی ہے۔

الطاف بیٹے! اَب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یورپ میں گھر کا کیا تصور ہے میں نہیں جانتا مگر ہمارا گھر تو ہماری چھوٹی سی ایک دُنیا ہوتی ہے۔ جس میں رہنے والے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک درخت کی طرح جس کی شاخیں زمین کے اندر ایک دوسری سے گتھی ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر بزرگوں کی شفقتوں، جوانوں کے قہقہوں اور بچوں کی معصوم مسکراہٹوں سے آباد رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ ہماری زندگی کی رونق ہے۔ ہماری زندگی کی بہار ہے۔ اسی میں زندگی کا سارا حسن ہے۔

یہاں تنہائی مجھے اندر ہی اندر چاٹتی رہی ہے۔ مجھے اب اس کا علم ہوا ہے۔ میرے پیارے بیٹے! آؤ اپنے بیمار اور لاچار باپ کو اُس گھر میں لے جاؤ جس میں اس کا حقیقی سکون ہے۔ آؤ الطاف، جلدی آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

یہ تحریر پڑھ کر اُس کے اندر ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ کئی منٹ تک ٹہلتا رہا۔

بخشو آیا۔ "جناب کھانا لے آؤں جی"

"مجھے یہ بتاؤ منظور بھی کیوں بگڑ رہا ہو؟"

بخشو سوچ کر بولا۔

"جناب! میں نہیں جانتا۔ اُس نے ہاجرہ کو دیا ہوگا۔ وہ بھول گئی ہوگی۔"

"اس کے گھر سے کوئی آیا تھا؟"

"مرنے کے بعد اُس کا بیٹا آیا تھا اور میت لے گیا تھا۔"

وہ پھر کمرے میں پھرنے لگا۔

"کھانا لے آؤں جناب؟" بخشو نے پوچھا۔

اُس نے ملازم کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کتابیں اور کپڑے ایک طرف رکھنے لگا۔

بخشو اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ رات

اُس رات بھی ٹھک ٹھک کی آواز آرہی تھی۔

یہ آواز وہ کئی راتوں سے سُن رہا تھا۔ کبھی یہ آواز خاصی مدھم پڑ جاتی تھی۔ کبھی بلند ہو جاتی تھی اور کبھی گھڑ گھڑ میں ڈوب جاتی تھی، جیسے کوئی چکی پیس رہا ہو۔

اس کی چارپائی صحن کی دیوار کے ساتھ بچھی رہتی تھی اور وہ رات کو اسی چارپائی پر سوتا تھا۔ اس کمرے میں ایک اور چارپائی بھی تھی۔ جس پر اس کی بڑی بہن آرام کرتی تھی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد وہ جب اپنے بستر پر لیٹتی تھی تو اس قدر گہری نیند اس کے اعصاب پر چھا جاتی تھی کہ اسے ارد گرد کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کا بھائی بھی ایک آرام دہ گدے پر ایک خوشنما لحاف سے اپنا سارا جسم ڈھانپ کر سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیتا تھا، مگر آدھی رات کے وقت جب اس قسم کی آواز اس کے کانوں میں آنے لگتی تھی تو وہ بے قرار ہو کر کروٹیں بدلنے لگتا تھا۔ اس آواز سے محفوظ ہونے کے لیے لحاف اپنے چہرے پر پھیلا دیتا تھا۔ کانوں میں انگلیاں دے لیتا تھا۔ لیکن وہ آواز نہ جانے کس طرح اسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی آواز سے بچنے کی کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی تھی۔

وہ خوب جانتا تھا کہ یہ آواز کیوں آرہی ہے۔ کہاں سے آرہی ہے۔ وہ دو تین بار بستر سے اُٹھ کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اُس چھوٹے سے کمرے میں جھانک چکا تھا۔ جہاں ایک طرف کچھ ڈبل اینٹیں، چکی، ہلدی کا ڈھیر، مختلف اوزار اور ان کے علاوہ لالٹین کی نحیف و ضعیف، روشنی میں دو ہاتھوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور بے بسی کے عالم میں دوبارہ چارپائی پر آچکا تھا۔

اس رات بھی ٹھک ٹھک کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

یہ آواز سن کر وہ بے قرار اور مضطرب پہلے بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اس رات اس کا اضطراب کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ ایک کانٹا اس کے پورے جسم میں وقفے وقفے سے چُبھ رہا ہے۔

یہ چبھن اُسے بستر سے اُٹھا کر، لحاف سے الگ کر کے ننگے پاؤں فرش پر کھڑا کر دیتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بہن کو پکارے، چیخے، چلائے، وہ چھوٹے کمرے کی طرف چند قدم بڑھ بھی جاتا تھا۔ لیکن پھر چلتے چلتے اس طرح رُک جاتا تھا جیسے کسی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں اور وہ آگے بڑھ نہیں سکتا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکتا۔

ٹھک ٹھک کی آواز اب چکّی کی گھڑ گھڑ میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اب چھوٹے کمرے میں کس عمل کی ابتدا ہو چکی ہے۔

رات گزرتی جا رہی تھی اور اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے دیوار کے ساتھ اپنی پشت لگا دی تھی .....

"کیا کروں ..... کیسے کروں؟" یہ سوال پیہم اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی سی ضربیں لگا رہا تھا اور جب بھی ذہن پر نئی ضرب پڑتی تھی۔ وہ دیوار سے الگ ہو جاتا تھا اور پھر اسی طرح پشت دیوار سے لگا دیتا تھا۔

جنوری کی راتیں بڑی ٹھنڈی ہوتی ہیں ..... مگر اسی ایک ٹھنڈی رات میں اس کی پیشانی پر بار بار پسینے کے قطرے آ جاتے تھے۔ جنھیں وہ دائیں ہاتھ سے صاف کر کے بھی ہاتھ دیوار پر پھیرنے لگتا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال اس طرح دَر آیا، جیسے طلوع ہوتے ہی سورج کی پہلی کرن روشندان سے اندر آ کر کمرے کے کسی گوشے کو نیم روشن کر دے۔

اس خیال کے آتے ہی اسے اپنے مضطرب دل میں کسی قدر اطمینان کی کیفیت آ گئی اور بغیر شعوری طور پر اس کی پشت دیوار سے کھسکنے ہوئی تکیے سے مس کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔

صبح اٹھا تو وہی روزمرہ کے معمولات تھے۔ باپ مسجد میں نماز پڑھ کر واپس آ چکا تھا اور اب اپنی چارپائی پر بیٹھ کر ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ بہن آٹا گوندھ کر کنالی ماں کی پیڑھی کے پاس رکھ چکی تھی۔ ماں باورچی خانے میں آ کر ابھی تک اپنی مخصوص پیڑھی پر نہیں بیٹھی تھی۔ وہ گھڑے میں برتن دھو رہی تھی۔ چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ ماں برتن اٹھا کر آئے گی۔ پہلے رات کا سالن گرم کرے گی۔ پھر روٹیاں پکا۔ پکا کر چنگیر میں رکھتی جائے گی تو بہن پیالے میں سالن ڈال کر، روٹیاں ایک تھالی میں رکھ کر چارپائی کے اوپر باپ کے سامنے دھر دے گی۔

باپ کی عادت ہے کہ وہ چند نوالے حلق سے اتارنے کے بعد دو تین گھونٹ پانی کے ضرور پیتا ہے۔ اس لیے بہن چارپائی پر ناشتا رکھنے کے بعد الماری میں سے شیشے کا گلاس پکڑ کر اس تانبے کی مٹی کی طرف چلی جاتی ہے۔ جو اس کی ماں اپنے جہیز میں لائی تھی اور جس میں ہر وقت ضرورت کے مطابق پانی موجود رہتا ہے۔

باپ ناشتے سے فارغ ہو کر سیدھا گھڑے کی طرف جاتا تھا۔ جہاں اس کی بیٹی جلدی مٹی میں سے لوٹا بھر کر باپ کے ہاتھ دھلا دیتی تھی۔ کلی کر کے وہ اپنی دکان پہ چلا جاتا تھا۔ اور دوپہر کو آدھ گھنٹے کے لیے صرف کھانا کھانے کے لیے آتا تھا۔

اس صبح وہ بے تابی کے عالم میں باپ کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ باپ جب ناشتے سے فارغ ہو جاتا تھا تو وہ ماں کے قریب پیڑھی پر بیٹھ کر خود چند منٹ کے اندر اندر ایک روٹی پیٹ میں اتار کر اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو جاتا تھا۔ اسے پہلی ٹیوشن ساڑھے سات بجے لینا ہوتی تھی اور وہ جس لڑکے کو اس وقت پڑھاتا تھا وہ اس کے گھر سے کافی دور رہتا تھا۔

باپ نے پگڑی سر پہ رکھ لی تھی۔ بیٹے نے معمول کے مطابق ناشتا نہیں کیا تھا اور ماں اس کی بہن کسی قدر حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ابا!" بیٹے نے باپ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر کہا۔ باپ رک کر بیٹے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں بیٹے سے پوچھ رہی تھیں۔ "کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں روکا

ہے مجھے؟"

بیٹے نے باپ کے خاموش استفسار کا مفہوم بخوبی سمجھ لیا تھا۔

"ابا! میرے ساتھ چلیں گے؟"

"جانا کہاں ہے، کیوں جانا ہے؟"

"بس ذرا تھوڑی دُور تک۔"

باپ سوچ رہا تھا، بیٹے نے پہلے کبھی ایسا نہیں کہا تھا۔ وہ اسے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔

"آخر پتا تو چلے، جانا کہاں ہے؟"

"آپ کو معلوم ہو جائے گا ابا!"

ماں اور بہن، باپ بیٹے میں یہ مکالمہ بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھیں۔

"جانا کب ہے؟"

"جب آپ کو ذرا فرصت ہو۔"

"ٹھیک ہے آج دکان کے لیے مارکیٹ سے سودا لانا ہے، بارہ بجے نکلوں گا۔۔۔۔ دکان پر آجانا۔۔۔۔ پر۔۔۔۔ خیر تم جانو۔"

باپ نے دائیں ہاتھ کو اس انداز سے جنبش دی، جیسے کہنا چاہتا ہو "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔" اور وہ ہاتھ ہلا کر دروازے سے نکل گیا۔

ماں اور بہن۔۔۔۔ دونوں کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اتر کر اصل بات معلوم کرنا چاہتی تھیں مگر بیٹے نے منہ پھیر لیا تھا۔

"اکبر! باپ کو کہاں لے جانا چاہتے ہو۔" ماں نے پوچھ ہی لیا۔

"یہ معاملہ میرا باپ کے ساتھ ہے امی! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی چوکھٹ پر پہنچ گیا۔

"ناشتا؟" بہن نے وہیں سے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"دیر ہو گئی ہے باجی! وہ لوگ مجھے جاتے ہی جائے دے دیں گے۔

"پر ناشتا تو کرو۔"

بھائی نے کوئی جواب نہ دیا اور دروازے میں سے نکل گیا۔۔۔

دوپہر ڈھل رہی تھی اور باپ بیٹا خاموشی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ باپ کے اندازِ رفتار میں تھکاوٹ کی وجہ سے سستی تھی۔ اس کے برعکس بیٹا دو تین قدم باپ سے آگے نکل جاتا تھا اور پھر باپ کے قریب پہنچنے کا انتظار کرتا تھا۔۔۔

"جانا کہاں ہے؟" باپ تین بار یہ سوال پوچھ چکا تھا۔ اور بیٹے نے ہر بار ایک ہی فقرہ دہرایا تھا۔

"ابا! تھوڑی دور اور۔"

"بتاؤ تو، کچھ خریدنا ہے؟" یہ بات باپ نے بیٹے سے پہلی بار پوچھی تھی۔

چند ماہ سے باپ گھر کی کئی چیزیں خرید لایا تھا، اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کی ہر فرمائش پوری کر دی تھی، بیٹے نے ابھی تک کسی شے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ باپ کو یقین تھا کہ شاید آج اپنے لیے کچھ خریدنا چاہتا ہے اسی لیے وہ اسے گھر سے لے آیا ہے۔

بیٹے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

باپ کو اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی، کیسا بیٹا ہے کہ باپ اس کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے اور وہ اس سے بالکل بے نیازی کا اظہار کر رہا ہے۔

دونوں ایک ساتھ ہسپتال کے بڑے دروازے میں داخل ہو چکے تھے۔

باپ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی تیز تیز سوالیہ نظریں اس کے سینے میں اتارنے لگا۔

"ذرا آگے جانا ہے ابا۔"

"ہمارا یہاں کیا کام ہے؟"

"ابھی پتا چل جائے گا ابا۔"

اب وہ بیڈ سیٹوں پر سے گزر کر، تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ایک زنانہ وارڈ میں پہنچ چکے تھے۔ وارڈ کی ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک بیسیوں چارپائیوں پر میلے کچیلے کمبلوں کو شانوں تک پھیلائے مریض عورتیں، لڑکیاں پڑی تھیں۔ زرد چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں، بعض خلا میں چپ چاپ نیم بے ہوشی کے عالم میں مسلسل گھورتی ہوئی، بعض کھانستی ہوئی، بعض تکیوں سے پشت لگائے بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی، وہ خاموشی سے ان چارپائیوں کے درمیانی حصے سے چلے جا رہے تھے۔

آخری دیوار کے قریب، چند بستر چھوڑ کر ایک چارپائی پر ایک لڑکی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ یہاں آ کر بیٹے کے قدم رک گئے تھے۔

"یہ میرے بچپن کے ایک دوست کی چھوٹی بہن ہے۔ اس بہن کے سوا اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"اچھا کیا جو مجھے یہاں لے آئے، بات گھر میں بھی کر سکتے تھے۔ میرے یہاں آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔"

اور یہ کہہ کر باپ نے اپنا ایک ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ وہ جیب کے اندر اپنی انگلیوں سے ان کرنسی نوٹوں کا اندازہ لگا رہا تھا جو وہ باہر نکالنا چاہتا تھا۔ بیٹے نے اس کی حرکت بھانپ لی تھی۔

"نہیں ابّا۔"

اور اس نے باپ کا ہاتھ اس طرح پکڑ لیا تھا کہ وہ اس ہاتھ کو آسانی سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔

"کیوں؟"

"نہیں ابّا۔"

"تو مجھے یہاں لانے کا مطلب؟"

باپ بیٹے کی آوازوں سے لڑکی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اور وہ دونوں کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

"آیئے ابا!" بیٹا باپ کو وارڈ سے باہر لے آیا تھا۔ باپ کا ہاتھ ابھی تک جیب کے اندر ہی تھا۔

"تم عجیب احمق ہو مجھے یہاں لانے کا مقصد کیا تھا؟"

باپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"کچھ بتائیے؟"

"کیا مطلب؟"

بیٹا خاموش ہو گیا، وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔

"کچھ کہو گے بھی؟"

بیٹے کے چہرے کے تاثرات واضح کر رہے تھے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔

غصے کی وجہ سے باپ کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

"ابا!"

بیٹا رک گیا تھا۔ باپ کا ہاتھ جیب سے نکل کر اس کے ماتھے پر پھر رہا تھا۔

"مجھے کس لیے لائے تھے یہاں — ؟ مدد کروں اور تم نے مجھے مدد کرنے ہی نہیں دی۔"

باپ ذرا اٹکا ..... "احمق کہیں کے۔"

"ابا۔"

"کچھ بکو بھی۔"

"ابا! یہ لڑکی میرے بچپن کے دوست کا تنہا سہارا ہے۔ یہ بیمار ہے، اس کے پیٹ میں ناسور ہو گئے ہیں ملاوٹ والی چیزیں کھانے سے، پتا نہیں زندہ رہے گی یا نہیں۔ آپ ہرگز نہیں چاہتے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا۔ نہ جانے اس بستر کے ساتھ کتنی اور چارپائیاں بچھیں گی اور ان پر کتنے دھبے، وہ بچیاں آئیں گی، جن کے پیٹوں میں ملاوٹ والی غذا کھانے سے ناسور ہو گئے ہیں۔"

بیٹے نے ایک ہی سانس میں لمبا فقرہ باپ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شاید سوچتا تھا کہ اگر اس نے ایک ہی بار سب کچھ نہ کہہ دیا تو وہ پھر یہ ہی بات کہہ دینے میں ناکام رہے گا۔

"اس لیے تو میں مدد کرنا چاہتا تھا۔" باپ نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔

"ابّا! میں نے بتایا ہے نا! کہ اس کے پیٹ میں ملاوٹ والی" باپ نے زور سے ہاتھ ہلا کر اسے خاموش کر دیا۔

"سُن چکا ہوں، کان نہ کھاؤ میرے۔"

دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔

ہسپتال کے بڑے دروازے سے باہر آکر باپ بائیں جانب مڑ گیا۔

"گھر جاؤ گے؟"

"نہیں ابّا! میری دوسری ٹیوشن کا وقت ہو گیا ہے۔"

"تو جاؤ۔" اور باپ تیز تیز قدم اٹھانے لگا

وہ بھی عام راتوں کی طرح ایک رات تھی، جنوری کا آخری ہفتہ بیت رہا تھا، فضا میں پہلی سی سردی نہیں تھی۔

بیٹا دیر سے جاگ رہا تھا، اور کروٹیں بدل رہا تھا۔ بہن حسبِ معمول گہری نیند سو رہی تھی۔

یکایک کمرے کے باہر بجلی کا بلب جل اٹھا، اُس کی آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ وہ جلدی سے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگا۔

ایک سایہ دروازے پر آچکا تھا۔

"اکبر!" یہ تو اس کے باپ کی آواز تھی۔

"جی ابّا۔"

"جاگ رہے تھے؟"

"جی۔"

"صبح ہونے والی ہے" یہ کہتے ہوئے باپ اس کے قریب آچکا تھا۔

"کیا بات ہے ابا!"

"کوئی خاص بات نہیں۔ چند روز قبل تم نے مجھے کچھ بتایا تھا، ہسپتال لے جاکر۔ آج میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں، آؤ باہر میرے ساتھ۔" وہ باپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

رات کے سناٹے میں دونوں آگے پیچھے چلے جارہے تھے۔

چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے چکی پیسنے کی آواز آرہی تھی۔ باپ نے آہستہ سے کہا۔

"اندر جھانکو۔ جانا نہیں۔ بولنا نہیں، جھانکو اور واپس آجاؤ بس۔"

وہ سمجھ گیا تھا کہ اندر کوئی ہے، چکی خود بخود تو حرکت نہیں کرسکتی۔ نیم تاریکی میں باپ کی آنکھیں وحشیانہ انداز میں چمک رہی تھیں۔

یہ آج میرے باپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے مجھے؟

سوچنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ باپ کے ہاتھ نے اسے آگے بڑھ کر جھانکنے کا حکم دے دیا تھا۔

وہ آگے بڑھا، سانس روک کر اور آگے بڑھا اور دو ہاتھوں کو چکی گھماتے ہوئے دیکھا۔ نگاہیں ذرا اوپر اٹھیں، وہ اپنی نظروں پر اعتماد نہ کرسکا۔

"یہ چہرہ۔ یہاں؟" اس نے اپنے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس کیا۔

باپ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اسے اس کے کمرے میں لے آیا اور اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"جان گئے ہو یہ کون ہے؟"

بیٹے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"زبان سے کہو۔"

"شاید۔ ال۔ طاف۔"

"شاید نہیں حقیقتاً الطاف۔ اس بہن کا بھائی۔ جو تم نے ہسپتال کے ایک وارڈ میں مجھے دکھائی تھی اور کہا تھا، اس کے پیٹ میں ناسور پڑ گئے ہیں۔ یہ اس کا اپنا بھائی ہے، انکار کرتے ہو۔"

بیٹے کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی، اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

"اکبر۔"

"ہوں۔" بیٹے کے رندھے ہوئے گلے سے ایک باریک سی آواز نکلی۔

"اس بات کو سمجھ لو کہ ہم سب ایک زنجیر میں جکڑے ہوتے ہیں۔ اس زنجیر کا سرا کس کے پاس ہے۔ ہم نہیں جانتے اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں یہ زنجیر ہمیں جہاں لے جاتی ہے، چلے جاتے ہیں۔ ہم اسے توڑ نہیں سکتے...... توڑنے کی کوشش کریں گے تو زنجیر کا کچھ نقصان نہیں ہو گا۔ ہم خود ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔"

باپ کی آواز پانی کی طاقت ور لہر کی طرح جو زمین کے اندر دھنس جاتی ہے۔ اس کے کانوں میں اترتی ہی تھی۔

"بس اب آرام کرو، اطمینان کے ساتھ زندگی گزارو، وہموں کو دل سے نکال دو سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے تمہارا تم نے۔"

بیٹے نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔

"خود کو بیہودہ خیالوں کی اذیت مت دو، تمہارے اپنے بھلے کو کہا ہے، آرام کرو۔"

اور باپ کے چھوٹے کمرے کے اندر جانے کے بعد وہ کئی لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور پھر اپنی چارپائی کی طرف جانے لگا۔

اور پھر وہ رات آ گئی۔

وہ رات جب پولیس نے محلے کی ایک چھوٹی سی دکان کے مالک چودھری اصغر کو ملاوٹ کے جرم میں پکڑ لیا تھا۔

محلے کے ایک دوسرے دکاندار نے مخبری کی تھی، اور پولیس نے رات کو عین موقع پر چودھری

اصغر کے گھر پر چھاپہ مارا تھا۔ چھوٹے کمرے اور اس کمرے کی تمام چیزوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان میں الطاف بھی شامل تھا، جو چودھری اصغر کے ساتھ ہی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

گھر کے سارے بلب روشن تھے۔ صحن میں چودھری اصغر اور الطاف بھی کھڑے تھے۔ ان سے کچھ دور اکبر تھا۔ ماں تھی، اور بہن تھی۔ ماں سہمی ہوئی اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔ اس کی بیٹی نے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ متواتر ہچکیوں سے اس کا سارا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔

"تو یہ رنگ ڈھنگ ہیں تمہارے، لوگوں کو زہر کھلاتے ہو، شرم نہیں آتی؟"

اے۔ ایس۔ آئی کی غضبناک نگاہیں چودھری اصغر کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھیں۔

"سب کرتے ہیں۔ میں۔"

اے۔ ایس۔ آئی کی ڈانٹ نے چودھری اصغر کو فقرہ مکمل نہ کرنے دیا۔

"اور تم۔ کون ہو تم؟"

اشارہ الطاف کی طرف تھا۔ جس کے ہاتھوں پر ہلدی اور مرچوں سے بدنما دھبے پڑے ہوئے تھے۔

"الطاف۔"

"جرم میں برابر کے شریک ہو۔"

"میری بہن بیمار ہے، ہسپتال میں ہے، اس کے لیے دوائیں، خوراک، میری آمدنی۔"

"بہن کی بیماری کو بہانہ بناتے ہو۔ بے شرم۔ بے حیا، کیا اس گھر میں کوئی ذمہ دار آدمی نہیں ہے۔ اس کا بیٹا بھی ہے، کہاں ہے وہ؟"

"میں ہوں۔"

"گھر میں جرم ہو رہا تھا اور تم تماشائی بنے رہے۔ سب سے بڑے مجرم تم ہو۔"

"میں اعتراف کرتا ہوں۔"

"اعتراف کے بچے، جرم کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

بیٹا دو قدم آگے بڑھ گیا۔

"نہیں دے سکا۔ میں ڈرتا تھا۔ لوگ کہیں گے وہ دیکھو۔ ظالم بیٹا جا رہا ہے جس نے اپنے باپ کو گرفتار کرا دیا تھا۔ اس خیال نے مجھے روک دیا تھا۔"

"تو اب باپ کے ساتھ خود بھی گرفتار ہو گئے ہو۔ بے چلو ان تینوں کو تھانے میں۔"

اور سپاہیوں نے ان تینوں کے گرد گھیرا ڈال لیا، آہستہ آہستہ سب کے قدم دروازے کی طرف جانے لگے۔ ماں اور بہن پیچھے پیچھے چلیں، دروازے کے باہر بے شمار لوگ کھڑے تھے۔

بیٹی نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ ماں بھی پیچھے ہٹ گئی ..... اور رات چپ چاپ گزرتی رہی۔

ساتھی

قیامِ پاکستان سے پہلے شہر کا یہ بیرونی حصہ جو نرائن باغ کہلاتا تھا اور جو کم و بیش آدھ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے مالک لالہ نرائن داس تھے۔ لالہ نرائن داس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا۔ جو اپنی نیک نامی کی خاطر کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ لالہ نرائن داس کی یہ زمین ویران پڑی تھی۔ لالہ جی نے سوچا اگر یہاں باغ لگوا دیا جائے تو اچھی خاصی نیک نامی ان کے حصے میں آ جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اور چھ سات ماہ کے بعد یہ زمین ایک باغ میں منتقل ہو گئی۔ ابھی یہ باغ مکمل نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ آبادی پاکستان سے بھارت کو اور بھارت سے پاکستان آنے لگی۔

لالہ نرائن داس اپنے خاندان کے ساتھ بھارت روانہ ہو گئے۔

افراتفری کا زمانہ تھا، کسی کو بھی اس باغ کا خیال نہ آیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن مہاجرین کو نئے بنائے مکانوں میں آباد ہونے کے وسائل میسر نہیں تھے اور جو بہت غریب تھے۔ انہوں نے پودے اور درخت کاٹ کاٹ کر یہاں جھگیاں بنانا شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی مدت میں یہاں جھگیوں کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا۔

جھگیوں کے اس شہر میں دو جھگیاں دو مداریوں کی بھی تھیں۔ یہ مداری بندروں کا تماشا دکھا دکھا کر رزق روٹی کماتے تھے۔

ان میں سے ایک مداری کا نام فیروز دین تھا۔ مگر کبھی کسی نے اسے فیروز دین کہہ کر مخاطب

نہیں کیا تھا۔ سب اسے پھوجا کہتے تھے۔ دوسرا شخص دین سے حسو بن گیا تھا۔

پھوجا بوڑھا ہو چکا تھا، اس کی ساری متاع ایک بندر تھا جو نمردا تھا۔ اس کی بندریا کو مرے ہوئے ایک سال بیت گیا تھا۔ پھوجے کو اپنے بندر سے بہت محبت تھی۔ جس کا نام نادر تھا۔ اصل میں نادر اس کے اکلوتے بیٹے کا نام تھا جو اپنی ماں کی وفات سے چند ماہ بعد کچھ روز بیمار رہ کر مر گیا تھا۔

پھوجے کو اپنے بندر میں بیٹے کی شکل نظر آتی تھی۔ اس لیے وہ اسے بیٹا ہی سمجھتا تھا اور نادر کہہ کر اسے بلاتا تھا۔

حسو جوان تھا، بیوی بچوں والا تھا۔ ایک بندر کے علاوہ اس کے پاس بندریا بھی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسو فائدے میں تھا لیکن پھوجا بھی نقصان میں نہیں تھا۔ حسو صبح سویرے اپنے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ گھریلو ذمہ داریاں پوری کر کے جب وہ بندر اور بندریا لے کر شہر کو جاتا تھا تو پھوجا تین چار بازاروں اور پانچ چھ گلیوں میں بچوں کو تماشا دکھا کر اچھے خاصے پیسے وصول کر چکا ہوتا تھا۔ حسو کو اپنے بوڑھے رقیب کی کامیابی پر بڑا غصہ آتا تھا۔ مگر کر کیا سکتا تھا۔ صبح سویرے شہر میں جانے سے معذور تھا۔ اور اس سلسلے میں پھوجے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ قریباً تیسرے پہر دونوں اپنے گھروں کو لوٹتے تھے۔ حسو تو سیدھا اپنی جھگی کی طرف چلا جاتا تھا۔ اور پھوجا پیپل کے پرانے پیڑ کے نیچے مائی ریشماں کے تنور پر پہنچ جاتا تھا۔

مائی اسے دیکھتے ہی کندوری سے دو روٹیاں نکال کر الگ رکھ دیتی تھی۔ پھوجا اپنے تھیلے میں سے مٹی کا پیالہ باہر نکال کر اس کے سامنے بڑھا دیتا تھا۔ ریشماں اس پیالے میں تھوڑی سی دال ڈال دیتی تھی اور روٹیاں اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتی تھی۔

پھوجا تنور کے پاس دوسرے لوگوں کی طرح بیٹھ کر روٹی نہیں کھاتا تھا، بلکہ ریشماں کو پیسے ادا کرنے کے بعد روٹیاں اور پیالہ لے کر اپنی جھگی میں آ جاتا تھا۔ دونوں چیزیں اپنی جھلنگا چارپائی پر رکھ کر وہ سب سے پہلے نادر کو پیار کرتا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑی شفقت سے بندر کے جسم پر پھرتا رہتا

اور اس کے منہ سے نادرے - نادرے پتر کے لفظ نکلتے رہتے تھے۔

وہ اپنے پیٹ کا خیال کرنے سے پہلے اپنے نادر کے پیٹ کا خیال کرتا تھا۔ وہ جب سیر شکم ہو جاتا تھا تو پہلا نوالہ اپنے حلق سے اتارتا تھا۔

پھوجے کو اپنی بیوی اور بیٹے کے مرنے کے بعد جو سب سے بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ وہ ایک بار نادر کے اچانک گم ہو جانے کا صدمہ تھا۔

ایک صبح وہ سو کر اٹھا تو معمول کے مطابق پکارا "نادرے او نادرے"

نادر تو پہلی آواز پر ہی اس کی چارپائی پہ آجاتا تھا مگر اس دن وہ نہ آیا۔

"میرا نادر کہاں گیا" پھوجے کو بڑی حیرت ہوئی اور اس لمحے اس کے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ یہ کارستانی اس کے دشمن ہی سنے کی ہوگی۔ بوڑھا ہونے کے کارن ایک لاٹھی تو وہ روزانہ اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور ایک بڑی مضبوط لاٹھی اس کی چارپائی کے نیچے پڑی رہتی تھی۔

اس نے یہ لاٹھی نکالی اور جتنی تیزی سے چل سکتا تھا، چل کر حسو کی جھگی کے پاس پہنچ گیا۔

حسو جھگی کے باہر ایک خوانچہ فروش سے چنے خرید رہا تھا پھوجے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لاٹھی اس کے سر پہ دے ماری۔

"دو میرا نادر"

پھوجے نے چوٹ کھا کر گرتے ہوئے حسو سے کہا اور دوسرا حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ہمسائے جھگیوں سے باہر آ گئے۔ پھوجے سے لاٹھی چھین لی اور حسو کو اٹھا کر بٹھا دیا۔

حسو کا سر پھٹ گیا تھا اور اس سے لہو بہہ رہا تھا۔ وہ زمین کے اوپر بیہوش پڑا تھا۔ اس کی بیوی پھوجے کو بے تحاشا گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔ اس کارروائی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ہمسایوں کی مداخلت سے پھوجے کو اس کا نادر مل گیا اور دوسرا نتیجہ یہ کہ پھوجے اور حسو کی عداوت اور دشمنی پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ اتفاق سے کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو پھوجا زور سے تھوک دیتا اور حسو فضا میں مکا لہرا کر گویا اس بات کا اعلان کر دیتا کہ وہ ایک نہ ایک دن

اس سے انتقام لے کر چھوڑے گا۔

جس روز بھوجے کو اپنا نادر حسو کے گھر سے ملا تھا۔وہ اپنی جھگی سے باہر نہ نکلا، بھوکا ہی اپنی جھلنگا چارپائی پر لیٹا رہا۔ اس کے تھیلے میں گلے سڑے پھلوں کے کچھ ٹکڑے پڑے تھے۔ان ٹکڑوں کو اُس نے صاف کر کے نادر کو کھلا دیے۔ اُسے اپنا پیٹ بھرنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔

قریب قریب ہر رات کو جب جھگیوں کے اندر دُبائی اور دھوئیں میں لپٹی ہوئی لالٹینیں تھوڑی تھوڑی، بیمار سی زرد روشنی اُگلنے لگتیں تو بھوجا نادر کو گود میں اٹھائے جھگی سے کچھ دور اُس گھاس کے قطعے پر بیٹھ جاتا جو پچھلی برسات کو زمین سے پھوٹ پڑا تھا۔

ایسے میں بھوجا نادر کو گود سے اتار کر آزاد چھوڑ دیتا تھا کہ اپنی مرضی سے گھوم پھر کر واپس آجائے مگر نادر تھوڑی دیر بعد ہی واپس اپنے مالک کی گود میں آ کر دبک جاتا تھا۔کیونکہ ادھر ادھر کی جھگیوں میں رہنے والے بچے اُسے پریشان کر دیتے تھے۔

بھوجا نادر کے پیچھے بھاگتے ہوئے بچوں کو دیکھتا تھا تو اس کے ہونٹوں سے صرف ایک ہی فقرہ نکلتا تھا "ناں یارو ناں۔میرے نادر کو تنگ ناں کرو"

بچوں کو ان کی مائیں زبردستی گھروں میں لے جاتیں تو بھوجا سُکھ کا سانس لیتا اور کبھی اُدھر آسمان کو دیکھنے لگتا اور کبھی اس کی نگاہیں اندھیروں میں ڈوب ڈوب جاتیں۔اپنی بیوی اور بچے کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

نادر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے مالک کے چہرے کو دیکھتا اور اس کا دایاں ہاتھ غیرارادی طور پر بھوجے کی بوڑھی گال پر پھرنے لگتا۔اور دیر تک پھرتا رہتا پھر بھوجا نادر کو زور سے اپنے سینے سے لگا کر بھینچنے لگتا۔

تھوڑی دیر بعد بھوجا اندر جھگی میں چلا جاتا۔چارپائی پر لیٹ جاتا اور نادر چارپائی کے نیچے اس کے پائے سے پیٹھ لگا کر آرام کرنے لگتا۔اُس روز بھوجا شہر کے بڑے بازار میں تماشا دکھا رہا تھا۔ وہ ڈگڈگی بجا رہا تھا۔اور نادر ہاتھ میں لاٹھی تھامے اکڑ اکڑ کر چلا جا رہا تھا اور بھوجا بتا رہا تھا

کہ نادر شادی کے بعد پہلی بار اپنے سسرال جا رہا ہے۔ بندر کی اکڑ فوں دیکھ دیکھ کر تماشائی ہنس رہے تھے
اُس روز سکولوں میں چھٹی تھی۔ لڑکوں کی کافی تعداد وہاں جمع ہو گئی تھی۔

تماشا ہو رہا تھا کہ سامنے سے ایک کار جو تیزی سے آ رہی تھی۔ رُک گئی۔

کار کے ڈرائیور نے بندر کو راستے سے ہٹانے کے لیے بار بار ہارن بجا کر مجمع کو الگ ہو جانے کے لیے کہا۔ مگر نادر تو بڑی سرگرمی اور انہماک سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا، اُسے ہارن کا احساس ہی نہ ہوا۔

کار کا مالک بڑبڑاتا ہوا کار سے نیچے اُترا اور اُس نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر پوری طاقت سے بندر کی پسلی پر لات ماری۔ بندر ایک دم گھبرا گیا۔ لاٹھی پھینک کر جان بچانے کے لیے قریبی حلوائی کی دُکان میں جا گھسا۔

دُکان میں ادھر اُدھر مٹھائیوں کے تھال سجے ہوئے تھے۔ بندر ان سے ٹکرایا تو تھال گرنے لگے مٹھائی دکان سے باہر جا پڑی۔

حلوائی نے بندر کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر وہ بھاگ گیا اور لڑکے اس کا پیچھا کرنے لگے۔
حلوائی نے پھوجے کو دبوچ لیا اور اس کے بوڑھے جسم پر گھونسوں سے پے در پے ضربیں لگانے لگا۔

لوگوں نے بڑی مشکل سے حلوائی کو ہٹایا۔ پھوجا زمین پر گرا پڑا تھا۔ اس کا کرتہ پھٹ چکا تھا اور جگہ جگہ سے لہو بہ رہا تھا۔

کچھ تماشائیوں نے رحم کھا کر اسے ہسپتال میں پہنچا دیا۔ جہاں اس کی مرہم پٹی ہو گئی۔

ہوش میں آتے ہی پھوجے نے بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔

"میرا نادر؟"

"نادر کون ہے؟" ایک نرس نے پوچھا۔

"نادر ۔۔ میرا بیٹا۔" پھوجے نے جواب دیا۔

"آ جائے گا پُتر تیرا۔ آرام کر بابا! زخم کھل جائیں گے۔"

کئی بار پھوجے نے ہسپتال سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن ہسپتال کے ملازموں نے اُسے روک لیا۔

وہ اپنی کوشش سے باز نہ آیا اور ایک دوپہر ہسپتال سے باہر نکل گیا۔

وہ سب سے پہلے اپنی جھگی میں گیا۔ جھگی میں چارپائی کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ لوگ اس کا سارا سامان لوٹ کر لے جا چکے تھے، اُس نے "نادرے! نادرے" کہہ کر زور زور سے پکارا، بار بار پکارا، مگر اسے نادر کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔

اس کا ہمسایہ شیرو جھگی سے باہر آ گیا۔

شیرو نے اُسے بتایا کہ آخری بار نادر کو اس نے اُس وقت دیکھا تھا۔ جب وہ ایک دیوار پر چڑھ گیا تھا اور لڑکے اُسے اینٹیں اور روڑے مار مار کر نیچے لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اینٹوں اور روڑوں کا ذکر سن کر پھوجے کی حالت غیر ہو گئی۔ اُسے چکر آ گیا اور وہ دھم سے گر پڑا۔

شیرو نے دو آدمیوں کی مدد سے اسے چارپائی پر لٹا دیا اور اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"میرا نادر۔"

شیرو نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی، اور تھوڑی دیر بعد تینوں آدمی پھوجے کی جھگی سے چلے گئے۔

وہ ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا کہ جھگی سے باہر آ گیا۔

ایک ایک بازار، ایک ایک گلی میں گیا۔ اس کا نادر کہیں بھی نہیں تھا۔

ایک شام وہ بھاری بھاری قدموں سے چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنے سامنے نادر کی جھلک دکھائی دی۔ وہ اپنی ساری قوت سے کام لے کر اُدھر گیا۔ "میرے نادرے" کہہ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا کہ کندھے پر یک لخت ایک بوجھ آ گرنے سے وہ تیورا کر گر پڑا۔

"اندھے ہو؟ یہ تمہارا نادر نہیں۔ یہ میرا بندر ہے۔"

یہ الفاظ کہنے والا حسو تھا۔ جس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا تھا۔

لوگ حسو کو شرمندہ کرنے لگے۔

"ایک بوڑھے پر ہاتھ اُٹھاتے شرم نہیں آتی تجھے۔" ایک بزرگ بولا۔

"میرا بندر چُرا رہا تھا۔" حسو نے جواب دیا۔

"یہ تو اپنے بندر کی جدائی میں پاگل ہو گیا ہے۔ بجائے رحم کرنے کے اسے مار ڈالا ہے تُو نے۔ بہت بُری بات کی ہے۔ اللہ سے ڈرو۔" بزرگ کی زبان سے یہ فقرہ سُن کر حسو سناٹے میں آ گیا۔

لوگ پھوجے پر جھکے ہوئے تھے۔

پھوجا نیم بیہوش تھا ـــــ اُسے اس کی جُھگی میں پہنچا دیا گیا تھا۔

پھوجے کے جانے کے بعد حسو کی کچھ عجیب حالت ہوئی۔ بزرگ کے الفاظ نے اس کے ذہن پر ایسا اثر کیا تھا کہ وہ لیٹنے کو تو چارپائی پر لیٹ گیا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔

وہ بار بار کروٹ بدل رہا تھا کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی حلق سوکھ جانے سے پانی پیتا تھا۔

اس کی بیوی اس کے پہلو میں گہری نیند سو چکی تھی۔

آخر بے چین ہو کر وہ اپنی جھگی کے دروازے پر آ کر بیٹھ گیا۔

وہ بیٹھا رہا۔ رات گزرتی رہی۔

حسو صبح منہ اندھیرے جھگی کے اندر گیا۔ اُس کا بندر معمول کے مطابق دروازے کے ایک پٹ کے اوپر بیٹھا تھا اور دوسرے پٹ پر بندریا سو رہی تھی۔ اُس نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور بندر کو اُتار لیا۔

بندر کی زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا، حسو نے کبھی اُسے صبح سویرے نہیں اُتارا تھا۔ بندر حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

بندر کو گود میں لے کر وہ نیم روشن اور نیم تاریک راہ پہ قدم اُٹھانے لگا۔

پھوجے کی جھگی کے دروازے پر پہنچ کر حسو نے اندر جھانکا۔

اُس کے سارے جسم پر ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ آگے بڑھا — چارپائی کے پاس پہنچ گیا۔

اس کی مبہوت نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مجبوجے کی چھاتی پر اس کا نادر اِس طرح جھکا ہوا تھا کہ اس کا سر اپنے مالک کی گردن سے جا لگا تھا۔

دونوں مردہ تھے۔

حسو جھگی سے باہر آ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

زنجیر

مُصنف کو فوت ہوئے تئیس روز بیت گئے تھے۔

اُس کی موت کی خبر کم و بیش سارے اخباروں میں چھپی تھی۔ دو تین اخباروں نے تو اِسے نمایاں طور پر شائع کر کے مصنف کے کچھ حالاتِ زندگی بھی درج کر دیئے تھے اور اس کی تصویر کے لیے گنجائش بھی نکال لی تھی۔ باقی اخباروں نے آخری صفحے پر چھاپ کر اپنی طرف سے افسوس اور غم کا اظہار کر دیا تھا۔

اِس کے حالاتِ زندگی میں بتایا گیا تھا کہ مصنف کا حقیقی نام وجاہت بیگ تھا مگر اُس نے اپنے والد کے نام کے پہلے حرف کو اپنے نام کے پہلے حرف کے ساتھ لگا کر وجاہت نواز کر لیا تھا اور یوں ادبی دنیا میں وجاہت نواز ہی کے نام سے اُس کی پہچان ہوتی تھی۔

اُس کے حالاتِ زندگی میں بتایا گیا تھا کہ وجاہت نواز نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اُس کے والد گورنمنٹ پریس میں مشین مین تھے۔ وجاہت کو بچپن ہی میں اپنی نانی اماں سے ہر رات مختلف کہانیاں سن سن کر ادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور جب وہ دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا تو اُس کی لکھی ہوئی کہانیاں بچوں کے رسالوں میں اشاعت پذیر ہونے لگی تھیں۔ باپ کی اچانک موت کے بعد اُسے تعلیم مجبوراً چھوڑنا پڑی اور وہ ایک دفتر میں بطور جونیئر کلرک کے کام کرنے لگا۔

انہی دنوں اُس کے چچا نے اُس کے بار بار معذرت کرنے کے باوجود اپنی بڑی بیٹی کی شادی اُس سے کر دی۔ جو نویں جماعت تک تعلیم حاصل کر چکی تھی۔

اِس دوران اُس کی ماں بھی دنیا سے چل بسی اور وجاہت ایک بچی کا باپ بن گیا۔

وجاہت کو ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ کلرکی میں اس کا مطلقاً دل نہیں لگتا تھا۔ جب بچ... وہ ایک اخبار میں کام کرنے لگا۔ وہاں سے نکلا تو ایک اشاعتی ادارے سے منسلک ہو گیا۔ اور زندگی بھر اسی ادارے سے وابستہ رہا۔ اُس کی اکثر کتابیں ادارے کے مالک کے نام سے چھپیں یا ان پر صرف ادارہ لکھ دیا گیا۔

یہ حالاتِ زندگی مصنف کے ایک ہمدم دیرینہ نے لکھے تھے جو اُس کے ساتھ ہی اخبار کے عملے میں شامل ہوا تھا اور اب اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے مقام پر پہنچ چکا تھا۔

مصنف کے اس ہمدمِ دیرینہ نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ وہ ایک مدّت سے ایک تصنیف میں مصروف تھا جسے وہ اپنی زندگی کا پہلا اور آخری شاہکار کہتا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے یہ تصنیف ایک ناول کی شکل میں ہے اور اس کا ایک باب چھپ کر بیحد مقبول ہو چکا ہے۔"

مصنف کے حالات کے آخر میں اس کی بیوی اور تین بچوں کا ذکر کر کے حکومت سے اس کی مالی امداد کی درخواست کی گئی تھی۔

تو وہ مصنف مر گیا تھا جس کا نام وجاہت نواز تھا اور جس نے اس دنیائے رنگ و بو میں انتالیس برس گیارہ دن گزارے تھے۔

مصنف کی تصنیف کا جو باب ایک رسالے میں چھپ چکا تھا اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ دو تین ناشرین نے کوشش کی کہ مصنف کی بیوہ سے اُس کی تصنیف خرید کر شائع کر دیں مگر اس کی بیوہ کو اس تصنیف کے مسودے کا کوئی علم نہیں تھا کہ کہاں پڑا ہوا ہے پھر شوہر کی موت نے اُسے جو ناگہانی صدمہ پہنچایا تھا اس کے اثرات ابھی اُس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ مرحوم کے کمرے میں جا کر اس کی الماریوں کے کاغذات نکال کر دیکھے اور مسودے کو ان کاغذات کے ہجوم سے الگ کرے۔

وہ یہ تو جانتی تھی کہ اس کا شوہر شام کے وقت گھر آ کر کچھ دیر اُس سے اور بچوں سے باتیں کرنے کے بعد خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا اور دیر تک وہیں بند رہتا تھا۔

بیوی کے استفسار پر اُس نے یہ تو ضرور بتا دیا تھا کہ وہ یہ کتاب لکھ رہا ہے۔ اِس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا تھا اور اُس کی بیوہ کو اِس کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل نہیں تھیں۔

ناشر مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔

اگر ایک فلاحی ادارہ بروقت مصنف کے خاندان کی مدد نہ کر دیتا تو مصنف کی بیوہ ضرور مسودہ ڈھونڈ نکالتی اور کسی نہ کسی ناشر کے حوالے کر کے جو کچھ مل جاتا اُسے وقتی طور پر غنیمت سمجھ لیتی مگر اِس امداد سے گھریلو اخراجات پورے ہو رہے تھے۔

اس کے شوہر کو مرے ہوئے ستائیس روز بیت چکے تھے۔

فلاحی ادارے نے جتنی رقم دی تھی اُس کا بیشتر حصہ ختم ہو گیا تھا اور مالی پریشانی دبے پاؤں مصنف کی بیوہ کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟"

یہ سوال وقفے وقفے سے اُس کا تعاقب کرنے لگا تھا۔

گھر کی مصروفیتوں اور عزیزوں کے آنے جانے اور باتیں کرنے میں دن کسی نہ کسی طرح گزر جاتا تھا مگر جب بچوں کو سلا کر وہ برتن مانجھنے یا اس قسم کا کوئی اور کام کرنے کی خاطر اپنی چارپائی سے اُٹھتی تھی تو یہ سوال بھی اُس کے ذہن میں جاگ اُٹھتا تھا۔

زندگی میں اس نے اپنے شوہر سے بارہا کہا تھا کہ "چھوڑو یہ نوکری کوئی ڈھنگ کی ملازمت کرو۔" مگر وہ ہر بار اُسے ٹال دیتا تھا اور وہ اِس وجہ سے اِس کا کچھ زیادہ اثر قبول نہیں کرتی تھی کہ اس کے شوہر کو بچوں کا بڑا خیال رہتا تھا اور جو کچھ کماتا تھا وہ اپنی ذات کی بجائے بیوی بچوں پر خرچ کر دیتا تھا۔

شوہر کے انتقال کے بعد وہ بیک وقت گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی تھی مگر وہ جو زندہ رہنے کی خواہش فطرتاً ہر انسان کے اندر دھڑکتی رہتی ہے بدستور اُس کے اندر موجود تھی، شاید اس خواہش کے پیچھے اُس کے بے سہارا بچوں کا وجود بھی کارفرما تھا۔

وہ ایک عقلمند خاتون تھی مصنف کے گھر میں آکر پہلے چند روز ہی میں اُس نے اندازہ لگا لیا

تھا کہ اب اُسے ایک ایک پیسہ احتیاط کے ساتھ خرچ کرنا ہوگا ورنہ زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو سکیں گی۔

مُصنّف اِسے اپنی خوش قسمتی تصوّر کرتا تھا کہ اسے ایک ایثار پیشہ رفیقۂ حیات مل گئی تھی جو اپنی آرائش و زیبائش کا قطعاً کوئی خیال نہیں کرتی تھی، کفایت شعاری سے گھر کا خرچ چلاتی تھی اور کسی سے ایک پیسہ بھی قرض لینا پسند نہیں کرتی تھی۔

اپنی ازدواجی زندگی میں اُسے بہت کم خوشیاں حاصل ہوئی تھیں تاہم اُس نے کبھی اپنے شوہر کی محدود آمدنی پر شدید احتجاج نہیں کیا تھا اور اب تو آمدنی کے محدود ذرائع بھی قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔

ستائیس دن گزر چکے تھے اور آج اٹھائیسویں دن کی صبح طلوع ہوئے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ صبح جاگتے ہی اُس نے بچوں کو ناشتا کرا دیا تھا اور اب یہ تینوں گھر کے باہر کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ صبح ہی سے اُس کا دل بار بار ڈوب جاتا تھا۔ نلکے کے نیچے جھوٹے برتن پڑے تھے لیکن اُس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ انھیں دھو کر معمول کے مطابق الماری میں رکھ دے یا جھاڑو دے کر گھر کی صفائی کرے۔ یاس آور خیالات بجلی کی رو کی طرح اسکے دماغ کی رگوں میں سرایت کئے جا رہے تھے۔ وہ پلنگ چارپائی پر گر پڑی۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ وہ بغیر کسی ارادے کے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اچانک اُس کے کان میں اُس کی بیٹی رضیہ کی باریک سی آواز آئی۔

"امی اسلم رو رہا ہے۔"

"کیا ہے رضو؟" وہ آواز سن کر بھی آواز کا مفہوم سمجھ نہیں سکی تھی۔

"اسلم ٹافیاں مانگتا ہے۔"

"ٹافیاں؟ اچھا لے دو پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

"نہیں امی۔"

"لے لو۔" اور اُس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر دو تین ٹکے نکالے اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

رضیہ نے آگے بڑھ کر کے لے لئے۔ "دیکھ رجو وہ کوئی گندہ بلا نہ کھاتے ۔ بیمار ہو جائے گا۔ بار بڑی بے خیال رکھنا۔"

"اچھا امی جی"

رضیہ تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل گئی۔

وہ ابھی تک چارپائی پر ہی نیم دراز حالت میں سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی۔ بے اختیاری کے عالم میں اُس نے تکیے کے نیچے سے ایک تہہ کیا ہوا اخبار نکالا یہ وہ اخبار تھا جس میں اُس کے شوہر کی موت کے تیسرے روز اُس کے مختصر سے حالات چھپے تھے۔

اُس کی نظریں بے محابا آخری سطروں پر پڑیں۔ جس میں تحریر تھا کہ "معلوم ہوتا ہے تصنیف ایک ناول کی شکل میں ہے۔"

ایک سوال اس کے باطن میں ایک ہیجان برپا کرنے لگا۔

شوہر کے مرنے کے بعد وہ اُس کے کمرے میں بہت کم گئی تھی۔ اصل میں اس کمرے میں جاتے ہوئے اُسے ایک قسم کی وحشت ہونے لگتی تھی اور وہ جلد سے جلد باہر آجاتی تھی۔

"یہ ناول ہے کہاں؟"

وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھی اور اُس کمرے میں چلی گئی۔

کمرہ دن کے وقت بھی عام طور پر نیم تاریک ہی رہتا تھا۔ اس تاریکی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اُس کا شوہر کمرے کی اکلوتی کھڑکی کھول دیتا تھا۔ فضا ابر آلود ہوتی تو لالٹین جلا کر لکھتا پڑھتا رہتا تھا مگر اُس کے جانے کے بعد کھڑکی کھلی ہی نہیں تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے پہلے ایک منٹ تک تو کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اُس نے کھڑکی کھول دی۔ کمرے کی چیزیں مدھم مدھم دکھائی دینے لگیں۔ ایک پرانی میز، ایک کرسی اور ہر طرف ریکوں میں کتابیں ہی کتابیں۔

یہ اُس کے مرحوم شوہر کی پوری کائنات تھی جس میں اُس کی زندگی کے بیشتر شب روز بسر ہوئے تھے۔

وہ میز کے پاس کھڑی تھی۔ کھوئی کھوئی سی اور سوچ رہی تھی کہ اس کے شوہر نے کتنی محنت سے، کتنی محبت سے اِن کتابوں کو جمع کیا تھا۔ مرحوم کو کتابوں سے بڑی محبت تھی۔ گھر کی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد مہینے کے آخری ہفتے میں جتنی رقم اس کے پاس بچ جاتی تھی اِس سے کتابیں خرید لاتا تھا۔ جنہیں ریکوں کے اندر کہیں نہ کہیں ٹھونس دیتا تھا۔

"اب اِن کتابوں کا مصرف کیا ہے؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔ "بچوں کے بڑے ہونے تک یہ سلامت رہیں گی؟ کون جانے۔" اس نے آہ بھر کر خود ہی جواب دیا۔

میز سے کچھ دور ایک الماری کے پاس اس کا حقہ بھی پڑا تھا۔ یہ حقہ اس کے لئے ایک ہمدم دیرینہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ رات دن وہیں رکھا رہتا تھا۔ اس کی بیٹی کو اِس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ باپ کمرے میں ہوتا تھا تو وہ اس سے پوچھے بغیر دو تین بار چلم تیار کر کے لے آتی تھی۔

وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہوتا تھا تو ہاتھ کے اشارے سے شاباش دے دیتا تھا اور کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوتا تو باقاعدہ بڑی پدرانہ شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا اور دو تین باتیں بھی کر لیتا۔

"اب اس حقے کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔" اس نے دل میں کہا۔

میز کے پاس کھڑے کھڑے اُسے ناول کا خیال آ گیا۔

اِس کی تلاش میں اُس نے میز کے دراز کھولنے شروع کر دیئے۔ کسی میں خالی کاغذ، قلم اور پنسلیں تھیں۔ کسی میں بجلی، سوئی گیس اور نلکے کے بل الگ الگ فائلوں میں محفوظ تھے۔ شوہر کی یہ بات اُسے خاص طور پر پسند تھی کہ سارے ضروری کاغذ وہ سنبھال کر رکھتا تھا چنانچہ جب بھی کسی کاغذ کی ضرورت پڑتی تھی آسانی سے نکال کر لے آتا تھا۔

ایک دراز میں ڈھیر سارے وہ خط پڑے تھے جو اس کے دوستوں نے، ساتھیوں نے، مداحوں نے یا رشتہ داروں نے بھیجے تھے۔ کچھ خط ایسے بھی تھے جو چند مشاہیر ادب نے اُسے لکھے تھے۔ یہ خط سب خطوں سے الگ بڑی احتیاط سے ایک تار میں پروئے ہوئے پڑے تھے۔

اُس نے آخری دراز کھولی۔ اس میں اس کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ایک گھڑی جو اس کے

ڈ نیدت مہ نے اس کے جنم دن پر کسی بیرونی ملک سے بطور ایک تحفہ عقیدت کے اسے بھیجی تھی۔ پرانی چیزیں، بچوں کے تاریخ پیدائش کے سرٹیفکیٹ تھے، نکاح کی انگشتری تھی۔

یہ انگشتری اُس نے اٹھائی اور اُسے غور سے دیکھنے لگی۔

یکایک اُسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے ہیں۔ اُس نے کرتے کے دامن سے گال صاف کئے اور وہ انگشتری وہیں رکھ دی۔

دراز کے آخری گوشے میں ایک گلابی رنگ کا لفافہ دکھائی دے رہا تھا۔

لفافہ دیکھتے ہی اُس کو احساس ہو گیا کہ انہوں نے جو اسے سب خطوں سے جدا کر کے رکھا ہے تو ضرور اس میں کوئی خاص بات ہو گی۔

وہ لفافہ اٹھا کر دیکھتی رہی۔

لفافے کے اوپر اُس کے شوہر کا پتا انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا اور لفافے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں سے خط نکال کر بار بار پڑھا گیا ہے کیونکہ لفافے پر ایک دو دھبے اس کی شہادت دے رہے تھے۔

وہ لفافے میں سے خط نکالنے لگی تو نہ جانے ایک لمحے کے لیے اس کے اندر یہ احساس کیوں پیدا ہو گیا کہ یہ خط اُسے پڑھنا نہیں چاہیے۔

"یہ میرے شوہر کے نام آیا ہے۔ بیوی ایسا خط کیوں نہیں پڑھ سکتی؟" یہ دلیل اُس نے اپنے آپ کو دی اور لفافے میں سے خط نکال لیا۔

ایک ایسی خوشبو اُس کے مشام میں در آئی گویا کہ وہ تازہ گلاب کو سونگھ رہی ہے۔

اُس نے کاغذ کی تہیں کھول دیں۔ تحریر مختصر تھی۔ صرف چار سطریں درج تھیں۔

مری کے دوران قیام میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ساری باتیں ایک ناول میں لکھ دیں گے اور یہ ناول آپ کی زندگی کا شاہکار ہو گا۔

میری نظروں میں آپ بڑے مصنف ہیں اور آپ کے متعلق میرے جذبات کیا ہیں۔

آپ خوب جانتے ہیں۔ میں التجا کرتی ہوں وہ ناول ہر حالت میں مکمل کر دیں اسے چھپے ہوئے دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہو گی۔

اس کے نیچے لکھنے والی کا نام 'ریحانہ' لکھا ہوا تھا۔

'ریحانہ' یہ نام اُس کے ہونٹوں سے اِس طرح نکلا کہ اُس نے محسوس کیا کہ آگ کا کوئی شعلہ اس کے لبوں کو چھو گیا ہے۔

خط اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ آنکھیں سامنے دیوار پر گاڑے کھڑی تھی۔

اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں۔ اس نے خود کو ایک کرسی میں گرا دیا۔

پورا ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ اُس کے اندر بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے خالی لفافہ اور اس کے ساتھ لکھا ہوا کاغذ میز پر رکھ دیا۔ پہلی الماری کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہاں اوپر سے نیچے تک مجلد اور منقش کتابیں قطاروں میں نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے اِن کتابوں کے پیچھے دایاں ہاتھ ڈال کر مسودے کو ڈھونڈا، مایوس ہو کر اُس نے دوسری الماری کھول دی۔ وہاں بھی کتابوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

اب صرف ایک الماری باقی تھی جو مقفل تھی۔ تالا چھوٹا سا تھا۔

اس نے پورا زور لگا کر تالا توڑنے کی کوشش کی مگر وہ ٹوٹ نہ سکا۔ وہ اسی لمحے کمرے سے نکل گئی اور جب لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک دستا تھا۔ چند ضربوں کے بعد تالا ٹوٹ کر اُس کے ہاتھ میں تھا۔

اُس نے تالا پرے پھینک دیا۔ الماری کھول دی۔

یہاں فقط مسودے تھے۔ اِن میں سے بعض چھپ چکے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی کسی ناشر کے ہاں نہیں پہنچے تھے۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک خوب صورت جلد پڑی تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور جلد اٹھائی۔ یہی وہ مسودہ تھا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھی۔

مسودہ اٹھائے وہ میز کے پاس آگئی اور مسودے کا پہلا ورق پلٹا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جلی حروف میں ناول کا عنوان درج تھا۔ "اندھیرے کا ستارہ" نیچے ناول کا لفظ لکھا گیا تھا اور صفحے کے آخری حصے میں مصنف کا نام درج تھا۔ 'وجاہت نواز'

اُس نے ورق پلٹا۔ 'پہلا باب' کے نیچے تحریر کا آغاز اس سطر سے ہوا تھا۔ "مری کی ایک برفانی شام کو ریحانہ اس کی زندگی میں یوں داخل ہوئی جیسے اندھیرے میں یک لخت ایک ستارہ چمک اُٹھے۔"

وہ ورق گردانی کرنے لگی۔

جہاں جہاں بھی اس کی نظر پڑتی تھی 'ریحانہ' کا نام اُس کے سامنے آجاتا تھا۔

"اُف میرے اللہ!"

اُسے محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی آنکھوں میں نشتر سے چبھنے لگے ہیں۔ اس نے مسودے سے نگاہیں ہٹالیں اور اپنا دایاں ہاتھ زور زور سے پیشانی پر ملنے لگی۔ شاید اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔

مسودہ اس کی آنکھوں سے ایک فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا اور اُسے ایک سنگین حقیقت کا احساس دلا رہا تھا۔

اُس نے مسودے سے نظریں ہٹالیں۔ اور اس لمحے گلابی رنگ کا لفافہ اُس کی آنکھوں میں چبھنے لگا۔

اُس وقت اُس کی بیٹی رضیہ دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

اپنی ماں کو اس سے پہلے اُس نے ایسی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ ماں کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

اب ماں نے مسودے کی جلد الگ کر دی تھی اور کسی ارادے سے اُٹھنے ہی والی تھی کہ رضیہ کی آواز آئی۔

"امی!"

"کیا ہے؟" وہ گرجی۔

"وہ ۔ ایک صاحب آئے ہیں ۔ کہتے ہیں بہت ضروری کام ہے"۔

"کون ہے؟" ماں کے لہجے میں بدستور جھنجھلاہٹ تھی۔

"پتا نہیں جی ۔ بیٹھک میں بٹھا دیا ہے"۔

"مجھ سے پوچھے بغیر؟"

بچی کانپ اٹھی۔

"کیوں بٹھایا ہے اُسے ۔ احمق ۔ گدھی"۔

رضیہ اس خوف سے کہ امی پٹائی نہ کر دے ۔ باہر نکل گئی۔

بیٹی کے جانے کے بعد وہ خود بھی دروازے سے نکلنے لگی۔

مصنف نے یہ کمرہ ملاقاتیوں کے لیے وقف کیا ہوا تھا ۔ اس کی دہلیز پر اس نے قدم رکھا تو ایک خوش لباس اجنبی کو کرسی میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔

اجنبی دروازے ہی کی طرف دیکھ رہا تھا اس لئے اُسے وہ آواز سننے میں کوئی دقت نہ ہوئی جو اس کے پیچھے سے آئی۔

"جی"

"آداب عرض ہے بیگم صاحبہ ۔ میں اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں ۔ میرا نام عارف ربانی ہے اور میں ایک مشہور اشاعتی ادارے 'عارفین' کا مالک ہوں ۔ مرحوم کے ناول کا ایک باب میرے ہی رسالے میں چھپ کر بیحد مقبول ہوا تھا ۔ میں ناول شائع کرنا چاہتا ہوں ۔ بہت معقول شرائط پر"۔

یہ کہہ کر ناشر خاموش ہو گیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا ۔ کوئی آواز اس کے کانوں تک پہنچی ۔

ان شاء اللہ یہ ناول بہت مقبول ہوگا ۔ میں ہر ایڈیشن کی بیس فی صد رائلٹی پیشگی دوں گا ۔

اس طرح آپ کو مالی پریشانیوں سے نجات بھی مل جائے گی اور مرحوم کی محنت بھی بار آور ہو جائے گی

آپ نے سمجھ لیا نا"۔ وہ خاموش تھی ۔ اُس نے دوبارہ کہا۔

"سمجھ لیا ہے نا"۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔

"تو آپ ہی — پہلے ایڈیشن کی پیشگی رقم۔"

"مگر مسودہ کہاں ہے؟" سوال کیا گیا۔

"مسودہ — گھر میں ہے۔ مرحوم نے مرنے سے ایک ہفتہ پیشتر مجھے اطلاع دی تھی کہ ناول مکمل ہو چکا ہے اور جلد ہی آپ کے حوالے کر دوں گا — آپ کو علم ہوگا کہ کاروبار میں سے ایک دم بڑی رقم نکالی نہیں جا سکتی — میں رقم کا انتظار کر رہا تھا بکل ملی ہے اور آج حاضر ہو گیا ہوں۔"

"مگر وہ —"

"اُن کے کمرے میں ہوگا۔ جا کہاں سکتا ہے — آپ ان کے کمرے میں نہیں گئیں — بہت دکھ ہوا ہے آپ کو۔ جانتا ہوں۔ لیکن۔ دیکھئے نا — موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

دو منٹ گزر گئے۔

"بیگم صاحبہ!" کوئی جواب نہیں۔ دو تین منٹ اور گزر گئے۔

کمرے میں بچی آ گئی۔

"امی نے کہا ہے۔ وہ ملے گا تو بات ہو گی۔"

ناشر کو اس قسم کے سلوک کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اُس جیب سے اپنا کارڈ نکالا۔

"لو بیٹی — اس پر میری دکان کا پتا درج ہے — اپنی امی کو دے دینا اور کہنا کہ میں انتظار کروں گا۔"

ناشر اُٹھ کر جانے لگا۔ رضیہ کارڈ لے کر قدم اٹھانے لگی۔

وہ شوہر کے کمرے میں جا چکی تھی۔

"امی! یہ دیا ہے اُس نے اور کہا ہے میں انتظار کروں گا۔"

رضیہ کارڈ ماں کی طرف بڑھا کر نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔

"چلی جاؤ۔"

ماں کا حکم سن کر رضیہ نے کارڈ میز کے اوپر رکھ دیا اور جانے لگی۔

"سنو" لڑکی جاتے جاتے ٹھہر گئی۔

"ادھر کوئی بھی نہ آئے — بالکل نہ آئے۔ سن لیا"

اثبات میں سر ہلا کر لڑکی چلی گئی۔

اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور شدید ہیجانی کیفیت میں پھرنے لگی۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی جیسے کمرے کا فرش سخت گرم ہو گیا ہو۔

لحظہ بہ لحظہ اس کی ہیجانی کیفیت میں اضافہ ہونے لگا۔ اُس کی رفتار میں تیزی آنے لگی۔ شدتِ ہیجان سے اُس کے ڈیلے پھیل گئے تھے۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

مسودے پر نگاہ پڑتے ہی وہ رُک گئی۔ میز کے پاس آ کر اُس نے مسودہ اٹھا لیا اور پہلے چند ورق اپنی گرفت میں لے کر اُسے پھاڑنے ہی والی تھی کہ دروازے پر پے بہ پے تحاشا دستک ہونے لگی۔

"امی۔ امی"

رضیہ کی مضطرب آواز آ رہی تھی۔

اُس نے مسودہ رکھ دیا۔ جلدی سے جا کر دروازہ کھولا۔

رضیہ چھوٹے بھائی ناصر کو شانے سے لگائے کھڑی تھی۔

"امی — ناصر کو — پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ قے پر قے کر رہا ہے۔"

"کیا ؟" ماں کا چہرہ اُس کی اندرونی پریشانی ظاہر کر رہا تھا۔

"بولتا بھی نہیں — امی —" بچی رونے لگی۔

ماں نے دونوں بازو پھیلا کر بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

"ناصر — ناصر"

اس کا بدن بہت ہلکا پڑ گیا تھا۔ کرتہ قے سے لتھڑا ہوا تھا۔

"ناصر — ناصر — ناصر"

اُس نے بچے کے بے جان سے جسم کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

دوسرا بچہ اندر جا کر چپ چاپ بہن کے پاس کھڑا ہو گیا تھا اور بُری طرح کانپ رہا تھا۔

ماں نے تیسری بار ناصر کو پکارا اور اُس کے حلق سے ایک باریک سی آواز امی کہتی ہوئی نکلی۔

ماں نے اسے پھر کھینچ لیا۔ اُس کے ماتھے کو چوما۔

اب ناصر آہستہ آہستہ رونے لگا تھا۔

لمحے وقت کے اندھیروں میں ڈوب رہے تھے۔ ماں کی نظریں کبھی مسودے کو دیکھتی تھیں اور کبھی اپنے بچوں کو۔

پھر جیسے اُس نے کوئی فیصلہ کر لیا۔

"رجو بیٹی"

"جی۔ امی؟"

"ناصر کو سنبھالو — میں ابھی آجاتی ہوں"

ناصر بہن کی گود میں دے کر اُس نے ناشر کا کارڈ اٹھایا۔ اور اُس کے ہاتھ مسودے کی طرف بڑھنے لگے۔

"ابھی آجاتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ مسودہ لے کر کمرے سے نکل گئی۔

صُبح

اُس کی اکتیس سالہ زندگی میں یُوں تو ہزاروں صبحیں آئی تھیں مگر آج تک کسی صبح نے بھی اُس کے قلب و ذہن پر کچھ دیرپا اثرات نہیں چھوڑے تھے۔ اپنے ماضی کے دھندلکوں کے اندر نگاہیں دوڑا کر وہ کسی ایسی صبح کا تصور نہیں کر سکتا تھا جو اپنے خوب صورت مناظر کے ساتھ اُس کے باطن میں طلوع ہوئی ہو اور اس کی خوشگوار یادیں اُس کے شعور میں زندہ ہوں۔

اس نے اب تک یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ صُبح اپنے ساتھ کیا کچھ لے آتی ہے اور جو کچھ لے آتی ہے وہ انسانی دِل پر کیا کیفیت چھوڑ جاتا ہے۔

اول تو وہ شروع ہی سے رات دیر سے سونے اور دن کو دیر سے جاگنے کا عادی تھا پھر کالج سے باہر نکلنے کے بعد وہ ایک اخبار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اخبار کے دفتر میں بارہ بجے سے پیشتر کبھی نہیں جاتا تھا اور جب فارغ ہو کر واپس آتا تھا تو رات کا پہلا پہر گزر چکا ہوتا تھا۔ صبح دیر ہی سے آنکھ کھلتی تھی۔ مگر اُس روز نہ جانے کیسے وہ صبح سویرے جاگ پڑا تھا۔

اور جب اتفاق سے جاگ ہی پڑا تھا تو بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ گرم گرم بستر سے نکل کر اوپر کوٹھے پر چلا جائے اور کچھ دیر وہاں ٹھہر کر صبح کی رعنائیوں سے لُطف اُٹھائے۔

سردیوں کے دِن اور سردیوں کی راتیں تھیں اور اُس رات جب وہ اخبار کے دفتر سے لوٹا تھا تو کھانا کھائے بغیر لحاف میں گھس گیا تھا اور چند منٹ بعد ہی گہری نیند سو گیا تھا۔

صُبح کے چار بجے تک اُسے اپنے تَن مَن کا ہوش نہیں تھا لیکن جیسے ہی بابا اللہ دِتا کے گھر

سے مُرغ کی آواز بلند ہُوئی وہ بیدار ہو گیا۔ ان لمحوں میں نیند جیسے اُس کی آنکھوں سے بالکل غائب ہو چکی تھی اور وہ اپنے اندر بستر سے چمٹے رہنے کی ذراسی خواہش بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔

اس کے کمرے کی کھڑکی سردیوں اور گرمیوں میں بند ہی رہتی تھی۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی روز جاگ کر کھڑکی کھولنے کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مگر اُس روز ایک بے نام خواہش کے زیرِ اثر وہ بستر سے اُترا تو سیدھا کھڑکی کی طرف جانے لگا۔

کھڑکی کے دونوں پَٹ کھول کر وہ ذرا آگے جھک کر صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

نہ جانے اُس دن کی صبح میں ایسی کیا کشش تھی کہ کھڑکی میں کھڑے رہنا اُسے زیادہ اچھا معلوم نہ ہُوا۔ اسے تنگیٔ نگاہ کا احساس ہُوا اور وہ اس خیال سے کہ گھر والوں کی نیند قدموں کی چاپ سے خراب نہ ہو جائے، آہستہ آہستہ چل کر، سیڑھیاں طے کر کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔

کوٹھے کے اُوپر ہر طرف ایک بہت پیاری، بڑی رنگین صبح مسکرا رہی تھی۔

صبح اتنی خوبصورت ہوتی ہے یہ بات کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی۔

وہ صبح بڑی روشن تھی، نزہت آگیں، لطافت بار ـــ دُور کہیں کہیں مدھم سے ستارے چمک رہے تھے اور اس کے سر کے عین اوپر ایک ستارہ زیادہ روشن تابندہ اور درخشندہ نظر آ رہا تھا۔

کیا یہ وہ ستارہ ہے جِسے ہر لکتے ہیں! ہو سکتا ہے وہی ہو جبھی تو اس قدر تابناک ہے۔

اُس کی نظر ایک آدھ منٹ تک ستارے پر جمی رہی پھر اُس نے بے اختیاری کے عالم میں مشرق کی طرف دیکھا۔

روشنی ہی روشنی ـــ گویا روشنی کا ایک طویل قافلہ اپنے راستے پر چلا جا رہا ہے۔ خاموشی کے ساتھ، بغیر کسی صدائے جرس کے۔ آگے ہی آگے چلا جا رہا ہے۔

اُسے اقبال کی بہت خوب صورت نظم "ذوق و شوق" کا پہلا شعر یاد آ گیا ؎

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

گو چشمۂ آفتاب ابھی وادی مشرق میں کہیں چھپا ہوا تھا لیکن نور کی ندیاں تو یہاں وہاں، جہاں تہاں رواں دواں تھیں۔

ایسی خوب صورت صبحوں کے نظارے سے محروم رہنا زندگی کی کتنی بڑی محرومی ہے۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا اور اسے افسوس ہوا کہ ایسی بیشمار صبحیں آئیں اور اس کے قلب و نظر کو چھوئے بغیر ماضی کے غاروں میں چھپ گئیں۔

ایک عجیب، مبہم سی خوشی شبنم کے اُن قطروں کی طرح جو بلندیوں سے نیچے اُتر کر پھولوں کی نازک پتیوں پر جگمگانے لگتے ہیں۔ اس کے سینے میں ننھے ننھے سے دیئے جلا رہی تھی۔

وہ آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا جہاں کبھی کبھی دفتر سے واپس آ کر بیٹھ جاتا تھا اور شام تک مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اُس کی نظریں نیم روشن، نیم تاریک فضاؤں میں اِدھر اُدھر تیرتی جا رہی تھیں کہیں کہیں بادل کے ہلکے ہلکے ٹکڑے۔ کہیں کہیں لرزتے سے ستارے اور کہیں کہیں مختلف رنگوں کی چھوٹی چھوٹی سی فضا میں بکھرتی ہوئی دنیائیں۔

اِن میں زندگی کا حُسن ہے۔ کائنات کا حُسن ہے۔ ایک پُر اسرار سی جاذبیت اور دلآویزی ہے۔

اس وقت فضا کتنی پُرسکون ہے۔ دفتر میں تو ہر وقت ایک طوفانِ شور و غوغا برپا رہتا ہے کسی سے کچھ کہنا ہو تو چنگھاڑ ہی میں کہنا پڑتا ہے۔ اُس کے دل میں خیال آیا اس سوچ میں لمحے آہستہ آہستہ گزرتے گئے اور اُسے اِن کے رخصت ہونے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

اس نے بارہا موسیقی کی محفلوں میں شریک ہو کر ایسے ایسے نغمے سُنے تھے جنہوں نے اُس کے دل و دماغ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری کر دی تھی مگر اُس وقت پرندوں کے چہچہاسے اُن تمام نغموں سے مختلف محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے اندر اپنی ایک دلکشی تھی، اپنی ایک کشش تھی۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ یہ ملکوتی موسیقی کبھی ختم نہ ہو۔ مگر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ اپنی باطنی دنیا میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ یہ خلا کیسا تھا۔ شاید وہ خود کو اس حسن میں، اس سکون میں، اس نور و ضیا میں پوری طرح جذب نہیں کر سکا تھا۔ شاید اسے کسی اور شے کی جستجو تھی۔ اس کی نگاہیں کچھ اور دیکھنے کی آرزومند تھیں۔ اس کا دل کسی اور منظر کی دبی دبی خواہش سے کچھ بے تاب تھا۔

وہ آرام کرسی کی پشت سے ہٹ کر شاہ نشین کے قریب چلا گیا۔

یہ شاہ نشین اُس کی بچپن کی ساتھی تھی۔ شام کے قریب اپنے دوستوں کے ساتھ وہ یہیں بیٹھ کر اپنے اُستادوں، کتابوں اور آنے والے امتحانوں کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا۔ اُن دنوں اِن باتوں کے علاوہ اُسے کچھ اور بہت کم سوجھتا تھا۔

کئی منٹ وہ اُس دَور کی یادوں میں کھویا رہا۔ عین ان لمحوں میں ایک پرندہ، اس کے سر کے اوپر چہچہایا اور تیزی سے اڑتے ہوئے اس حویلی کے پیچھے غائب ہو گیا جو محلے میں سب سے اونچی تھی۔ محلے سے باہر بھی کوئی مکان بلندی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

حویلی پر نظریں پڑتے ہی ایک دم اُس کے دل کی حرکت تیز ہو گئی۔

'شہلا'— ایک خوب صورت نسوانی پیکر اس کے قریب آ گیا۔

"شہلا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔" ہر بار شہلا کو مخاطب کر کے وہ یہ فقرہ کہنا چاہتا تھا لیکن یہ الفاظ اُس کے دِل سے نکل کر ہونٹوں تک نہیں آتے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے اور پھر خاموشی کے عالم میں ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے۔

شہلا اُس کے ایک دُور کے رشتہ دار کی بیٹی تھی۔ جو محلے کی سب سے اونچی حویلی میں رہتی تھی جس کے بھائی اپنے ملک اور ملک سے باہر اونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اُس کا والد ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تھا۔

سوسائٹی میں اس گھرانے کی بڑی عزت تھی ۔ اس کے برعکس میں وہ ایک معمولی صحافی تھا۔ اس کے حویلی میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی ۔ جب بھی وہ وہاں جاتا تھا شہلا مسکرا کر اس کی پذیرائی کرتی تھی اور یہی چیز اُس کے ایک خواب کو چپکے چپکے تاب و توانائی دے رہی تھی۔ شہلا کو مطالعے کا بہت شوق تھا اور وہ اس کے لیے لائبریری سے نئی نئی کتابیں ایشوع کروا کر لے جاتا تھا جسے پاکر وہ بہت خوش ہوتی تھی ۔ وہ دونوں چند لمحوں کی ملاقات میں فقط رسمی باتیں ہی کرتے تھے لیکن ان کی نگاہیں ایک دوسرے سے وہ راز کہہ چکی تھیں جو انسانی زندگی کا سب سے قیمتی، سب سے خوب صورت راز ہوتا ہے۔

باہمی اعتماد کی فضا میں وہ ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر، ایک دوسرے کو کچھ بتائے بغیر اپنے اس خوشگوار مستقبل کی تعمیر کرتے رہتے تھے جو ایک کا نہیں۔ دونوں کا مشترکہ مستقبل تھا ۔

اور ایک شام جب وہ لائبریری کی پچھلی کتابیں واپس لانے کے لیے اُس کے ہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ شہلا اندر گئی اور کتابوں کا ایک ڈھیر اُٹھا لائی جسے اُس نے میز کے ایک کونے میں رکھ دیا۔

"صفدر صاحب!" وہ بولی اور اس نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز میں ایک لرزش سی تھی۔

وہ اسے صفدر صاحب کہہ کر مخاطب نہیں کیا کرتی تھی ، صرف صفدر کہتی تھی، پھر آج اس نے اس کے نام کے ساتھ صاحب کیوں جوڑ دیا ہے ۔ وہ حیران ہوا اور شہلا نے یہ کہہ کر اُسے مزید حیران کر دیا۔

"دیکھئے آپ کی کوئی اور کتاب میرے پاس ہے تو نہیں ۔ بتائیے؟"

اس کے اندر سے 'کیوں' کا لفظ ایک طوفانی قوت سے باہر آنا چاہتا تھا ۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا آج یہ سوال کیوں مجھ سے پُوچھ رہی ہو ۔ مگر اُس نے ضبط کیا ۔

"یہی ساری کتابیں ہیں آپ کی ؟" شہلا نے پوچھا ۔

"میرا خیال ہے بس یہی کتابیں ہیں ۔"

"ٹھیک ہے ۔ لے جائیے گا ۔"

وہ اُس کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالنا چاہتا تھا تاکہ اُس چھپے ہوئے جذبے کا اندازہ کر سکے جو اُس سے

ایسے الفاظ نکوار رہا تھا۔ مگر شہلا بات کہہ کر فوراً اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیتی تھی۔

"یہ کیوں، یہ کیوں؟" یہ سوال اُس کے ذہن میں ایک ہیجان برپا کئے ہوئے تھا۔

"شہلا۔"

"جی۔"

"وہ — یہ کتابیں اور۔"

"وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

"شکریہ آپ کا۔ بہت بہت۔" اور شہلا جانے لگی۔

"شہلا۔"

جاتے جاتے وہ رک گئی۔

"کہئے۔"

"یہ — کیوں؟"

"اُس نے کچھ نہ کہا۔ ایک لفظ بھی اس کے ہونٹوں سے نہ نکلا۔ وہ بے اختیاری کے عالم میں اُس کی طرف بڑھا۔ غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے۔ اب اُس کے اور شہلا کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

یکایک شہلا کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک نکلا اور اُس کے رخسار کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ شہ نشین کے پاس کھڑا تھا اور یہ سارا منظر اپنی ساری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں تلے پھر گیا تھا۔

یہ شہلا سے اُس کی آخری ملاقات تھی۔ کئی دن کے بعد اُس نے سُنا کہ وہ شادی کے بعد اپنے وطن سے بہت دور چلی گئی ہے۔

دفتر میں کام کرتے ہوئے کسی ریستوران میں چائے پیتے ہوئے، دوستوں سے گپ کرتے ہوئے، رات

کے پچھلے پہر سنسان سڑکوں پر تنہا قدم اٹھاتے ہوئے جب بھی اُسے یہ واقعہ یاد آجاتا تھا اس کی طبیعت بڑی اداس ہو جاتی تھی۔

"مجھے زندگی نے کیا دیا ہے؟"

وہ آہ بھر کر کہتا تھا اور اُس کے چلنے کی رفتار مدھم پڑ جاتی تھی۔

ایک اندرونی خلش سے بے قرار ہو کر اُس نے نظریں حویلی سے ہٹالیں اور اوپر دیکھا۔ صبح خاموش تھی۔ ستارے دھندلے پڑتے جا رہے تھے اور اُس کے سر کے اوپر ایک ستارہ بدستور بڑی تابناکی سے چمک رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں چبھن سی ہوئی اور اُس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ آنکھوں کے اوپر رکھ لیے۔

اس کے اندر ایک ہلچل مچی تھی اور وہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر، شہ نشین سے ہٹ کر دوسری سمت جانے لگا۔

وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں بیٹھ کر اُس نے ڈھیر ساری کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ الماریوں میں کتابیں بند تھیں اور ریکوں میں بھی کتابیں سلیقہ بندی سے رکھی ہوئی تھیں۔

یہ کتابیں اُس کی چھوٹی بہن نے سجا کر رکھی تھیں۔ مہپارہ کو اس کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اس کے کپڑے باقاعدگی کے ساتھ استری کرتی تھی۔ صبح دیر سے جاگتا تھا تو اُس کو چند منٹ کے اندر اندر گرم ناشتا مل جاتا تھا۔ اُس کی بہن کو بڑی آرزو تھی کہ اُس کے بھائی کا سہرا بندھے اور ایک خوب صورت بھابی گھر کی رونق بنے۔

بھائی سے وہ اپنی اِس آرزو کا اظہار بارہا کر چکی تھی اور اس نے ہر بار اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ اُس نے کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔

ایک بار پھر شہ نشین کے پاس پہنچ کر اُس کے قدم رک گئے تھے۔

حویلی اپنی پرانی دیواروں کے ساتھ خاموش کھڑی تھی اور ان دیواروں پر کہیں کہیں روشنی بکھری ہوئی تھی۔

ان دیواروں کے پیچھے اس کی خوشیوں کے کتنے ہی لمحے دفن ہو چکے تھے۔

کتاب لینے کے لیے مسکرا کر جب وہ اپنا خوب صورت اور پیارا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتی تھی تو اُس کا دل وفورِ مسرت سے کس طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ اور جب اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے چائے لینے کے لیے باورچی خانے کی طرف جاتی تھی تو یہ گھڑیاں۔ یہ انتظار کی گھڑیاں کتنی سہانی ہوتی تھیں۔

"لیجیے۔"

"کیا؟"

"آپ دیکھ نہیں رہے۔"

"دیکھ تو رہا ہوں۔"

"پھر لیجیے نا۔"

اور وہ میز پر چائے رکھ کر یونہی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگتی۔

کتنے ہی مناظر اُسے یاد آ گئے تھے۔

یہ سارے مناظر اب اُس کی یادیں بن گئے تھے۔ کرب انگیز یادیں۔

اور شیخ اُس سے بے نیاز اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

اس کو اپنی پلکوں تلے ایک ہلکی سی تپش کا احساس ہوا۔ اُسی لمحے اُس کی انگلیاں آنکھوں کی طرف بڑھ گئیں۔

"میں رو رہا ہوں۔"

اُسے اپنی یہ کیفیت عجیب لگی۔

"رو رہا ہوں، پناہ بخدا۔"

اُس نے انگلیوں سے آنسو پونچھ لیے۔ مگر آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے۔ اُس نے انگلیاں شالہ

اور شہ نشین پر بیٹھ گیا۔

وہ روتا رہا۔ ہچکیاں لیتا رہا اور لمحوں کا کارواں ٹھنڈی ہواؤں اور ڈوبتے ہوئے ستاروں کی مدھم ہوتی ہوئی روشنی کے ساتھ اپنے راستے پر گزرتا رہا،

شہ نشین پر بیٹھے بیٹھے اُسے کچھ دیر ہو چکی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔

اب اُس کے باطن میں سکون کی کیفیت ایک حد تک اُبھر آئی تھی۔

شاید یہ رونے کا اثر تھا کہ اس کے اندر کا گرد و غبار دُھل سا گیا تھا

اُس نے اوپر دیکھا۔ ستارہ چمک رہا تھا۔

وہ اُس ستارے کو جیسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا اور اُسے یک بیک تھملا کے آنسو کا خیال آ گیا

اور پھر اُسے احساس ہوا کہ ستارہ کہیں گم ہو گیا ہے اور یہ آنسو چمکنے لگا ہے جس کی روشنی اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہے مسلسل اترتی چلی جا رہی ہے۔

سرما کی ایک رات

وہ مکان کیا تھا اچھی خاصی حویلی تھی اور ارد گرد جو لوگ رہتے تھے وہ اُسے "لال حویلی" کہتے تھے اگرچہ اُس کی بیرونی دیواروں کا سُرخ رنگ اس حد تک ماند پڑ چکا تھا کہ موجودہ حالت میں اُسے دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ سرخ تھی اور اُس کی سُرخی میں بڑی چمک دمک اور آب و تاب بھی تھی۔ اب گو سرخی نام کی چیز باقی نہیں رہی تھی تاہم اس کا پرانا تشخص ختم نہیں ہوا تھا وہ "لال حویلی" ہی کہلاتی تھی۔

یہ حویلی دو منزلہ تھی اور اس کے سارے کمروں کی تعداد باورچی خانے اور غسل خانے کو نکال کر بارہ سے کم نہیں تھی۔ اوپر والی منزل کے بیشتر کمرے بالعموم خالی رہتے تھے اور باقی کمرے بھی سال میں چند ہفتوں کے لیے آباد ہو جاتے تھے اور ان چند ہفتوں کے اختتام پر زندگی کے ہنگاموں سے محروم ہو جاتے تھے۔ البتہ نچلی منزل کی یہ حالت نہیں تھی، اس کے کمروں میں ہاؤ ہو کا گزر ہوتا رہتا تھا۔ مگر ایک کمرہ ایسا بھی تھا جہاں زندگی کی لے بہت مدھم ہو چکی تھی۔ یہ نہیں کہ اس کمرے میں کوئی رہتا نہیں تھا۔ اس کی دیواریں رات دن ایک بوڑھے مرد اور ایک بوڑھی عورت کو دیکھا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ سالہا سال سے جاری تھا۔

وہ دونوں بستر پر خاموش لیٹے ہی نہیں رہتے تھے زندہ رہنے کے لیے وہ تمام کام کرتے تھے جو ضروری ہیں۔ وقت پر کھانا کھاتے تھے، لباس بدلتے تھے، کمرے کی صفائی کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے مگر ایک دوسرے سے الگ رہ کر، اپنے اپنے انداز میں، اپنے اپنے طور طریقے سے، کوئی خاص ضرورت پیش آ جاتی تو ایک دوسرے سے گفتگو بھی کر لیتے تھے لیکن یہ گفتگو چند فقروں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔

ان کی یہ ابنارمل کیفیت فقط ان لمحوں میں ایک حد تک نارمل ہو جاتی تھی جب ان کے ساتھ مستقل طور پر رہنے والا بڑا بیٹا دفتر سے واپس آکر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یا تنہا ان کے پاس آتا تھا اور گھر کے معاملات میں ان سے مشورہ لیتا تھا۔ اس کے اور اس کی بیوی کے آنے سے کمرے کی افسردہ سنجیدگی میں تھوڑا سا فرق پڑ جاتا تھا اور اس وقت بڑا نمایاں فرق پڑ جاتا تھا جب ان کے چاروں بچے بھاگتے ہوئے آتے تھے اور اودھم مچانا شروع کر دیتے تھے۔

دادا اور دادی اپنے پوتوں اور پوتی کے شور و غل اور پیہم مطالبات پر زچ بھی ہو جاتے تھے مگر کسی صورت بھی ناگواری خاطر کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے۔ جو کچھ وہ مانگتے تھے۔ انھیں بظاہر بڑی خوشی سے دے دیتے تھے۔ ان کا کوئی مطالبہ رد نہیں کرتے تھے۔

جب تک جاوید اور اس کی بیوی نسرین اپنے بچوں کے ساتھ اس کمرے میں رہتے تھے زندگی کے ہنگامے جیسے جاگ اُٹھتے تھے اور جیسے ہی ڈیڑھ دو گھنٹے گزارنے کے بعد وہاں سے نکلتے تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق سے ہو جاتے تھے۔ گویا زندگی تیزی سے آتی تھی اور دبے پاؤں واپس چلی جاتی تھی۔

حویلی میں اصل رونق اُن ایام میں آتی تھی جن دنوں ان کا چھوٹا بیٹا فرخ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ سے دو ماہ کے لیے وہاں آجاتا تھا۔ اوپر کے کمرے اس وقت آباد ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں یہ کمرہ دن رات بھرا بھرا رہتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی یہاں موجود رہتا تھا اور اس کی موجودگی میں ان کی ایک دوسرے سے لاتعلقی برقرار نہیں رہتی تھی۔

امریکہ والا بیٹا چلا جاتا۔ بڑا بیٹا جاوید دفتر روانہ ہو جاتا۔ بچے اپنے اپنے سکول میں یا کبھی کبھی اپنی خالہ کے ہاں چلے جاتے۔ ان کی بہو گھر کے کام کاج میں لگ جاتی تو اس کمرے کی چھوٹی سی دنیا پر سناٹا چھا جاتا۔ جس میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی افسردہ کھانسی ابھرتی، ڈوبتی رہتی تھی یا کرسی کے کھسکانے، شیلف سے کتاب نکالنے، چائے کی خالی پیالی تپائی پر رکھنے سے ذرا سی دھمک ہو جاتی تھی۔ بڈھے کو دمے کا عارضہ لاحق تھا۔ وہ گھوں گھوں کرتا رہتا تھا اور جب سگریٹ کے کش لگاتا تھا تو اس گھوں گھوں میں اضافہ

ہو جاتا تھا اور اس کا بگڑا ہوا چہرہ اور بگڑ جاتا تھا۔ اُس کی بیوی بہت کم چلتی پھرتی تھی۔ مگر جب شوہر بے تحاشا کھانسنے لگتا تھا تو وہ تین منٹ تک شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھتی رہتی تھی اور پھر چپ چاپ باہر چلی جاتی تھی۔ شوہر کو نہ اس کے کمرے کے اندر آنے سے تسکین ہوتی تھی اور نہ اس کے باہر چلے جانے پر ملال ہوتا تھا۔

پورے اٹھتیس برس انہوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کی تھی۔ اُن کی ازدواجی زندگی کا ثمر، دو خوبرو اور جوان لڑکے تھے جو خود بال بچوں والے تھے اور زندگی کے شاداب راستے پر چلے جا رہے تھے معاشی حالات خوشگوار تھے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔ لیکن یہ انہیں خدمت کرنے کا موقع دیتے ہی نہیں تھے یا کم دیتے تھے بڈھے کی پنشن معقول تھی۔ زندگی کے تیئیس برس اس نے ریلوے کے اعلیٰ افسر کے طور پر گزارے تھے۔ پنشن کی اُس رقم سے میاں بیوی کا بخوبی گزارا ہو جاتا تھا۔ بیٹوں اور بہوؤں سے ایک پیسہ لینے کے بھی روادار نہیں تھے بلکہ اُن کے بچوں کو کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے تھے۔

جاوید اور اس کے چھوٹے بھائی نے اپنے ماں باپ کو ہمیشہ ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر ہی پایا تھا اور یہ بات ان کے لیے ایک الجھن بن گئی تھی۔

فرخ امریکہ سے آتا تو ہوائی اڈے پر ہی بھائی سے پوچھتا۔

"بھائی جان! برف کی وہ سِل پگھلی ہے یا نہیں؟"

جاوید نفی میں سر ہلا دیتا۔

"آخر کیوں؟"

جاوید اس کا کوئی جواب نہ دیتا۔ دل میں ضرور کہتا۔ سِل پگھل کیونکر سکتی ہے۔ جب اسے پگھلانے کی کوشش ہی نہیں کی جاتی۔

فرخ جاوید کی طرح ماں باپ کے رویے سے کچھ ایسا مایوس نہیں تھا۔ موقع ملنے پر وہ ضرور ماں سے پوچھتا۔

"امی۔"

"مت پوچھو کچھ مجھ سے۔ مت پوچھو۔"

اُس کی ماں بیٹے کا فقرہ سنے بغیر کہہ دیتی۔ اُسے معلوم تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

فرخ بھائی سے پوچھتا۔

"آخر یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟"

"کبھی ختم نہیں ہوگا" جاوید کا جواب ہوتا۔ "امی ابو کا یہ مقدر نہیں ہے کہ وہ اس طرح رہیں جس طرح میں اور نسرین، یا تم اور نسیمہ رہتے ہیں۔ مقدر نہیں بدل سکتا۔" یہ الفاظ سن کر فرخ کو کچھ اور کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا۔

وہ رات عام راتوں ہی کی طرح ایک رات تھی۔ جاڑوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ حویلی کے اندر اس رات تین خاندان آباد تھے اوپر کی منزل میں فرخ اور اس کی بیوی بچے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ دوسری منزل میں جاوید جاگ رہا تھا۔ نسرین اور بچے سو چکے تھے اور ان سے تین کمرے دور آخری کمرے میں بوڑھے شوہر کی مسلسل کھوں کھوں سے بڑھیا سو نہیں سکتی تھی۔ چند منٹ کے لئے آنکھ لگتی تو پھر کھوں کھوں کی آواز ایک کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں چبھنے لگتی اور وہ کروٹ بدل لیتی۔ مگر کروٹ بدلنے سے کیا ہوتا ہے کھوں کھوں رک نہیں سکتی تھی۔

"یہ شخص ایک عذاب ہے۔" اس نے سوچا۔

وہ ایسی بے شمار راتیں گزار چکی تھی۔ جب بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ اس لئے یہ تجربہ اُس کے لیے نیا نہیں تھا۔ کئی بار اُس نے خود سے سوال کیا تھا۔ میں کہیں اور کیوں نہ چلی جاؤں — اس کے پاس رہ کر کیوں عذاب جھیلتی رہوں۔ لیکن وہ عذاب جھیلتی رہتی، کمرے سے باہر قدم نہ رکھتی۔ ایک نہ معلوم قوت ہر بار اُس کا یہ ارادہ توڑ دیتی۔

کھوں کھوں سے اُس کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ بے تاب ہو کر وہ بیٹھ گئی۔ کمرے میں زیرو نمبر کا بلب جل رہا تھا اور اس کی بے جان سی روشنی میں اس کے پلنگ سے کچھ دور دوسرے پلنگ پر ایک سایہ سا لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ بڑبڑانے لگی۔

"اس شخص نے مجھے کبھی سکون سے زندہ رہنے نہیں دیا۔ غیروں جیسا سلوک کیا ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔ پھر اس نے مجھے بیوی کیوں نہیں سمجھا۔ اسے چھوڑ کر جا سکتی تھی۔ یہ نہیں گئی۔ سوچتی رہی اس کا رویہ بدل جائے گا۔

پھر جاوید آ گیا۔ اور اللہ تو نے مجھے کس جرم کی سزا دی ہے۔"

اُس نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر رو نہیں سکتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ وہ رونے کی خواہش کے باوجود اپنی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہا سکی تھی۔ یہ کیفیت اس کے لیے بڑی کرب انگیز ہوتی تھی اور اُس رات بھی وہ ایسی ہی کرب انگیز کیفیت کے جبر کے سہہ رہی تھی۔

"کھوں، کھوں، کھوں، کھوں۔"

وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ کھانس رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کمرے کی واحد کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور سرد ہوا بغیر کسی رکاوٹ کے اندر آ رہی تھی۔

"تیز اور سرد ہوا آ رہی ہے، اُس نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دے!

وہ اُٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ پٹ بند کر دیئے اور لوٹنے لگی۔

اُس نے دیکھا کہ وہ پلنگ کے اوپر بیٹھا ہے اور اپنے دونوں ہاتھ چھاتی پر پھیلا رکھے ہیں۔ وہ اُس کے پلنگ سے بہت قریب ہو کر گزری۔ مگر آنکھ اُٹھا کر ایک لمحے کے لیے بھی اُسے نہ دیکھا۔

وہ اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ کھڑکی کے دونوں پٹ کھل کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

اسے خیال آ گیا۔ پٹ بند کر دیئے تھے چٹخنی نہیں لگائی تھی۔

وہ بیٹھی رہی پٹ بجتے رہے، متواتر بجتے رہے۔ اُس کے کانوں کے لیے شور ناگوار تھا تاہم وہ بیٹھی رہی۔

"نہیں میں اب نہیں اٹھوں گی۔ یہ خود اٹھے۔ آخر کبھی اِس نے میرے آرام کا بھی خیال کیا ہے؟"

اس نے کھڑکی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھوں کھوں کھوں کھوں۔

اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اضطراری حالت میں وہ اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ اُس کی ہتھیلی خشک تھی۔ آنکھوں نے اُس کی ہتھیلیوں کو ذرا سی نمی بھی نہیں دی تھی۔

اور ذرا دور کھڑکی کے پاس ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا۔

"اچھا تو خود پٹ بند کرنے گیا ہے۔ کرتا پھرے مجھے کیا!"

تین منٹ گزر گئے مضطرب خاموشی میں وہ سوچنے لگی۔ کھڑکی بند کر کے واپس آ گیا ہے۔ کھانسی تھم گئی ہے، سو چکا ہے اب میں کیوں بیٹھی ہوں مجھے بھی سو جانا چاہیے۔ بستر پہ لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ نہ جانے ایک غیر مبہم سی بے چینی کیوں بڑھتی جا رہی تھی۔

کھوں کھوں کھوں۔

یہ سویا نہیں، میں نے یونہی سمجھ لیا تھا کہ سو گیا ہے۔ کھانس رہا ہے۔

اب کے اس پہ کھانسی کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی لیکن محسوس کر رہی تھی کہ اس کا سارا جسم بُری طرح کانپ رہا ہے۔

"پا ۔۔۔ نی"

یہ ایک لفظ دو حرفوں میں بھٹ کر اُس کے کانوں سے ٹکرایا۔

پہلے بھی کھانستے ہوئے اس کے ہونٹوں سے کئی بار یہ لفظ نکلا تھا اور اس نے پلنگ سے اُٹھ کر پانی کا گلاس اس کی طرف خاموشی کے ساتھ بڑھا دیا تھا۔ گلاس دے کر کبھی اُس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ گلاس دے کر وہ کھڑی رہتی تھی تاکہ خالی گلاس واپس لے جائے مگر اس نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔ گلاس پاس پڑی ہوئی تپائی کے اوپر رکھ دیا تھا۔

"کیا میرا اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کیوں مجھ سے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتا۔"

چند منٹ بے کار کھڑے رہنے کے بعد واپس آ جاتی تھی۔

"کیا آج مجھے اسے پانی نہیں دینا چاہیے؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔

ایک بار پھر وہی آواز سرسرائی۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر گئی۔ دبے پاؤں لوٹ آئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ میں گلاس تھام رکھا تھا۔

کمزور روشنی میں وہ اپنے پلنگ پہ بیٹھا ہچکولے لیتی ہوئی کشتی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔

"پانی۔"

کانپتا ہوا ہاتھ گلاس کی طرف بڑھنے لگا اور اسے پکڑنے کی بجائے اُس کے ایک حصے کو چھونے لگا۔

"پانی"۔ بوڑھے نے کہا۔

انگلیاں پھیل گئیں۔ گلاس ان کی گرفت میں آ گیا۔ مگر ہونٹوں تک نہ پہنچ سکا۔ کچھ فاصلے پر رک گیا اور پانی گرنے لگا۔

اُس نے گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ سے اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بڈھا گھونٹ بھرنے لگا۔ اس کا جسم اُسی طرح کانپ رہا تھا۔

"بس۔"

"ہو۔ تھہ۔"

اُس نے گلاس لے لیا۔ کیا آج بھی اُسے پہلے کی طرح کچھ کہے، کچھ سنے بغیر اپنے پلنگ پر چلے جانا چاہیے اور وہ لوٹنے ہی والی تھی کہ اس نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ کو ذرا ہلایا۔ وہ اسے رک جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"عائشہ۔"

"اُسے اپنے کانوں پر اعتماد نہیں آ رہا تھا۔ کیا اُس کا نام اُس شخص نے لیا ہے جو شاید مدت ہوئی یہ نام بھول بھی چکا ہے۔

یکایک اُسے یوں محسوس ہوا کہ روشنی کی ایک تابناک کرن اندر آ گئی ہے۔ اُس نے جھک کر اپنی نگاہیں اُس کے چہرے پر جما دیں۔ وہاں ایک گہرا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ اللہ یہ سایہ کبھی دور نہیں ہو گا۔

"کیا دیکھ رہی ہو عائشہ۔"

ایک بار پھر عائشہ۔ "کیا تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں کتنے برسوں سے تمہارے ساتھ اس گھر میں زندہ ہوں۔ مگر تم نے کبھی مجھے زندہ سمجھا تھا۔ کیا سمجھتے رہے ہو کہ میں مر گئی ہوں اور یہ میں نہیں ہوں، میرا وہ سایہ ہے جسے میں یہیں چھوڑ کر دفن ہو گئی تھی۔ تم نے آج مجھے کیسے زندہ سمجھ لیا ہے خان جی!"

وہ اسے خاں جی کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتی تھی۔

"خاں جی"

وہ یہ لفظ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

ایک لمحہ گزر گیا۔ دو لمحے بیت گئے۔ کئی لمحے ماضی میں ڈوب گئے۔ وہ خاموش تھا۔ کیا میں نے دھوکا کھایا تھا۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ عائشہ کہہ کر اس نے مجھے مخاطب کیا ہے۔

بڑھیا کے ذہن میں کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے واپس جانے سے پیشتر غیر ارادی طور پر اس کی جانب دیکھا۔ اُس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں کے دائرے میں لے رکھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔

"عائشہ آنکھیں نیند آ رہی ہے؟" اُسے دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"نہیں خاں جی" اُس نے کس توقع پر یہ فقرہ کہا تھا یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

اُس کا جسم پہلے سے زیادہ کانپنے لگا تھا۔ جیسے ایک کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو۔ شاید وہ اپنی اندرونی کشمکش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش نے اُس کے چہرے کو کافی بھیانک بنا دیا تھا۔ ماتھے کی سیاہ رگیں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے اس طرح نمایاں ہو گئے تھے جیسے بدنما رسیوں سے کسی شے کو کس دیا گیا ہو۔

اُس کے دل میں خیال آیا۔

"اس مرد نے میری زندگی جہنم بنا دی ہے۔"

اس خیال کے آتے ہی وہ مڑنے لگی مگر اس خیال کے عقب میں ایک اور خیال آ گیا۔

"یہ مرد میرا شوہر ہے۔"

وہ ایک دم ٹھٹک سی گئی۔ یہ کس کرب سے گزر رہا ہے۔ مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

"بیٹھ جاؤ۔" یہ فقرہ واضح طور پر کہا گیا تھا۔

وہ تپائی کے پاس کرسی میں بیٹھ گئی۔

ٹمے نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اب اس کا چہرہ اتنا بھیانک نہیں لگ رہا تھا یا بڑھیا کی نگاہیں اسے پہلے جیسا بھیانک نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔

"عائشہ! اتنی دور — نہیں۔"

وہ کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا کہتے ہو خاںجی؟"

"میرے پاس۔"

وہ کرسی سے اُٹھ بیٹھی۔ کرسی کو اُٹھا کر قریب لانا چاہا۔

"نہیں عائشہ۔"

کیا وہ چاہتا ہے میں اس کے پاس پلنگ پہ بیٹھ جاؤں۔ یقیناً اُس کا یہی مطلب ہے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور فوراً اُسے احساس ہوا کہ وہ ایک انسان کے قریب سے ایک زندہ دھونکنی کے پاس آ بیٹھی ہے۔

اس پہلو میں وہ بڑی لمبی مدت کے بعد بیٹھی تھی۔ اُسے خیال آیا جب بہت پہلے وہ یہاں بیٹھی تھی تو اسے ایک عجیب حرارت محسوس ہوئی تھی۔ حرارت اب بھی وہ محسوس کر رہی تھی مگر اس حرارت میں بڑا فرق تھا۔ وہ حرارت ایسی تھی جیسے ایک صاف شفاف شمعدان جگمگا رہا ہو اور اس میں سے دھیمی دھیمی آنچ نکل رہی ہو اور یہ حرارت! جیسے جلتے ہوئے کوئلوں پہ پانی چھڑک دیا جائے اور ایک دم ایک گرم لپک، ناک اور آنکھوں پہ ٹوٹ پڑے۔

دونوں خاموش تھے۔ مرد اپنی کشمکش پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔

"عائشہ! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

اچھا اتنی لمبی مدت بعد تمہیں مجھ سے کچھ کہنے کا خیال آیا۔ میں بیٹھی ہوں، کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہ الفاظ عائشہ کے ذہن میں ابھرے اور ذہن ہی میں دب کر رہ گئے۔ اُس کے ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہی رہے۔

"عائشہ! تم کہو۔"

"میں۔ خاں جی! میں کیا کہوں گی۔" دراصل وہ کہنا یہ چاہتی تھی۔ مجھے کچھ کہنے کے قابل تم نے چھوڑا ہی کب ہے۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

وہ پوچھنا چاہتی تھی کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ مگر پوچھ نہ سکی۔

اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ اس طرح لرز رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس کے تمام اعضا بکھر جائیں گے۔ وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

"پانی لاؤں؟"

"ہوں۔"

وہ پانی کا گلاس لے آئی اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اب کے اُس نے تین گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔ پانی سے وہ کچھ سنبھل گیا۔ کھانسی کی وجہ سے اُس کی آنکھوں اور ناک میں جیسے کچھ جم گیا تھا۔ اپنا ہاتھ وہ وقفے وقفے سے آنکھوں اور ناک پر پھیر رہا تھا۔

یہ کتنی بڑی مشکل میں مبتلا ہے۔ میں اس کے لیے کیا کروں؟ اس نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے اُس کا چہرہ صاف کرنا چاہا۔

"نہ۔ نہ۔ نہ۔"

اُس کا حرکت کرتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

"خاں جی۔"

"کیا۔"

وہ کہنا چاہتی تھی۔ مجھے رو کو مت۔ میں تمہاری کچھ لگتی ہوں۔ کیا تم جانتے نہیں ہو خاں جی! میں تمہاری بیوی ہوں۔ مگر یہ الفاظ لبوں تک آتے آتے کہیں راستے ہی میں دم توڑ گئے۔

دھک دھک دھک دھک۔ اُس کا دل کتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کہیں یہ پھٹ نہ جائے۔

اوہ میرے اللہ، میرے مرد پر رحم کر۔ رحم کر میرے اللہ اس آدمی پر جو مجھے سمجھ نہیں سکا۔ جو مجھے ابھی تک جان نہیں سکا۔

خالی گلاس عورت کی گود میں پڑا تھا جیسے وہ اٹھانا بھول گئی تھی۔ وہ گر پڑا۔ چھن کی سی آواز آئی۔

"ٹوٹ گیا۔"

"کوئی بات نہیں خاں جی!" وہ یہی بات کہہ سکی۔ اُس کے دل میں تھا کہ یہ کہے۔ خاں جی! کبھی اس شیشے کا بھی خیال کیا ہے جسے تم نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

نہیں تم اس کا خیال نہیں کرو گے کیونکہ تم مرد ہو۔ خاں جی! میں درست کہتی ہوں نا۔

کھانسی سے نڈھال ہو کر وہ لیٹ گیا تھا اور مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"عائشہ!"

"ہوں۔"

"بولو۔ کہو۔ خاموش مت رہو۔ سب کچھ کہہ دو۔ شاید پھر کبھی نہ کہہ سکو!"

اُس نے پہلی بار اتنا لمبا فقرہ کہا تھا۔ اُس نے اپنی کھانسی پر وقتی طور پر قابو پا لیا تھا۔

"وہ سب سو رہے ہیں — وہ ہمارے بچے، میری اور تمہاری محبت کا ثمر۔ یہ دیواریں چپ چاپ کھڑی ہیں۔ انہوں نے ہماری محبت کا ابتدائی زمانہ دیکھا ہے۔ کیا سوچتی ہیں آج۔ مجھے اور تمہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں گی۔ ہم کیا تھے۔ ہم کیا ہو گئے ہیں۔ خاں جی! تم نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ ہم پھولوں بھرے راستے پر چل سکتے تھے لیکن تمہاری کبھی ختم نہ ہونے والی بدگمانی نے ہمیں اس شاداب راہ سے ہٹا کر کانٹوں میں دھکیل دیا۔ اور ہم زخم زخم ہو گئے۔ وہ ہماری شادی کے پہلے سات سال کیسی خوشیوں میں بیتے تھے، ہم اس دھرتی سے اٹھ کر کہاں پہنچ گئے تھے۔ بلندیوں پر، تاروں کی دنیا میں، قوسِ قزح کی وادی میں۔ تم کس قدر خوبصورت تھے، تمہارا دل کتنا خوبصورت تھا۔ تم خوبصورت ہی رہے مگر تمہارے دل کو بدصورتیوں نے بھیانک اور خوفناک بنا دیا۔ خاں جی! تم کیسی بے رحم دلدل میں اترتے چلے جا رہے تھے۔ میں تمہیں کیسے نکالتی۔ میرے ہاتھ بڑے کمزور تھے، تم نے میرے ہاتھوں کو بڑا کمزور کر دیا تھا۔ خاں جی! شادی کے سات سال بعد

تمہیں معلوم ہوا تھا کہ میں ناصر سے محبت کرتی رہی ہوں۔ یہ خبر غلط نہیں تھی۔ میں نے اسے بہت چاہا تھا۔ بیحد چاہا تھا۔ والہانہ انداز میں چاہا تھا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکے۔ تم میرے اباجی کی پسند تھے۔ میری امی بھی تمہیں پسند کرتی تھی۔ دونوں نے مجھے اٹھا کر تمھارے پہلو میں بٹھا دیا۔ میں روتی رہی سسکتی رہی۔ پھر جب میرا جاوید میری گود میں ہمکنے لگا تو میں نے اپنے زخم خوردہ خوابوں پہ راکھ کی موٹی تہ جما دی۔ مجروح خوابوں کو راکھ کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ لہو تو رستا ہی رہتا ہے۔ مگر خاں جی! میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ گو اس لہو کو بہنے سے نہیں روک سکتی مگر اس کی سرخی میرے چہرے پر کبھی نہیں آئے گی۔ پر خاں جی! آخر تم وہی نکلے نا مرد۔ بدگمان مرد۔"

عائشہ کہے جا رہی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے سن رہا تھا۔

"خاں جی! تم سمجھ نہ سکے کہ عورت تو ایک ندی ہوتی ہے جو اپنی منزل کی طرف بہتی رہتی ہے۔ راستے میں کتنی ہی اور منزلیں آتی ہیں۔ کتنے ہی نشیب و فراز۔۔ کتنے ہی شاداب مقام، وہ رکتی نہیں ہے۔ رکنا چاہے بھی تو نہیں رک سکتی۔ رکتی وہاں ہے جہاں اس کی حقیقی منزل ہے۔ تم میری حقیقی منزل تھے تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ میں آ گئی ہوں۔ تمہیں اپنی منزل جان کر آ گئی ہوں، پر تم تو میری پچھلی منزلوں کی سوچ میں گئے۔ برسوں پہلے جس منزل پہ پہنچی تھی تم نے سوچا میں "ابھی" تک وہیں ہوں، حالانکہ میں اس سے دور نکل آئی تھی۔ خاں جی! تم نے مجھ پہ ظلم کیا۔ میری چھوڑی ہوئی منزل کو اصلی منزل سمجھ لیا۔

عورت کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ اپنی اس حالت پر اُسے خجالت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں یہ نرم نرم سا مس کیسا، یہ نرماہٹ کیسی۔ یہ آنکھوں کو ایک نرم سی کیا چیز چھو رہی ہے! یہ پھول کی پتیوں کا گداز، یہ شبنم کی لطافت، یہ صبح بہاریں کے پہلے سانس کی خنکی، ہائے میں تو اسی چیز کے لیے ترستی رہی ہوں۔ آج یہ مجھے مل گئی ہے۔

مرد نے اپنی انگلیاں اُس کی آنکھوں سے ہٹا لی تھیں۔

"خاں جی" اس نے سرگوشی کی۔

"عائشہ میری۔ میری اپنی عائشہ۔ تم۔ تم۔ عائشہ"

ہائے یہ نغمہ اتنے برس کہاں گم ہو گیا تھا۔ آج کس بلندی سے اتر کر میری روح میں گھلنے لگا ہے۔ یہ قوسِ قزح کہاں سے آ گئی ہے۔ یہ بادِ نسیم اب تک کن بادلوں میں چھپی رہی تھی۔

"عائشہ!"

"عائشہ!"

"آنکھیں کھول دو عائشہ۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے، عائشہ" اس نے رونے کی خواہش دبانے کی کوشش کی اور کھانسی کا شدید حملہ اسے لرزہ براندام کر گیا۔

وہ اٹھنے لگی۔

"نہ جاؤ — عائشہ نہ جاؤ۔ یہ کیسے لمحے ہیں، بیحد قیمتی —— بے حد خوبصورت انمول۔ ایک بھی لمحہ ضائع ہو گیا تو زندگی میں خلا رہ جائے گا۔"

وہ بیٹھ گئی۔

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور لمحے گزرتے جا رہے تھے — گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے سینوں میں جو کچھ چھپا ہوا تھا وہ خاموشی کے ساتھ ایک آنکھ سے نکل کر دوسری آنکھ میں جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ — چپ چاپ اور پھر صبح کی روشنی روشندانوں سے اندر آنے لگی کمرے کے باہر زندگی کی ساری رونقیں جاگ اٹھیں۔ سارے ہنگامے بیدار ہو گئے۔

سب سے پہلے جاوید اندر آیا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر اسے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

دونوں نے بانہیں ایک دوسرے کی گردن میں حائل کر رکھی تھیں۔

"ابو —"

"امی —"

کوئی جواب نہیں — وہ آگے بڑھا۔ اور آگے بڑھا اور ایک دم چیخ مار کر دروازے کی طرف بھاگنے لگا!!